گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

کتابچہ "حدیث اور سنت" پر

نقد و نظر

بقلم

حبیب الرحمن اعظمی

استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، سہارنپور، یوپی

ناشر

مرکز دعوۃ و تحقیق دیوبند، سہارنپور یوپی

فہرست

موضوع **صفحہ**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ گفتنی

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی خاتم الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین.

اما بعد! حدیث وسنت کے الفاظ دینی معاشرہ بالخصوص طبقۂ علماء میں اس قدر معلوم ومعروف ہیں کہ اپنے معنی ومراد کی فہم ومعرفت میں کسی بحث وتحقیق اور تعریف وتفہیم کے چنداں محتاج نہیں ہیں، بایں ہمہ ایک نامور ومشہور فاضل گرامی نے بیرون ملک کے اپنے ایک خطاب میں ''حدیث وسنت'' سے متعلق ایک ایسا انوکھا دعویٰ اور غیر مانوس نظریہ پیش کیا جس کا سراغ اب تک کے معتبر ولائق اعتماد علمائے حق کے دستیاب علمی ذخیرہ میں نہیں لگایا جاسکتا ہے، مولانا موصوف کے اس خطبہ کا مرکزی مضمون جو اس کے عنوان سے ظاہر ہے یہ ہے کہ

۱- حدیث وسنت میں فرق ہے

۲- حجّت (معمول بہا) سنت ہے حدیث نہیں

آں موصوف نے اپنے بیرونی اسفار کے دوران جو خطبات دیے تھے بعد میں جب انھیں مرتب کر کے ''علمی خطبات'' کے نام سے شائع کیا تو اس مجموعہ میں اوپر مذکور خطاب کو بھی شامل کردیا، چونکہ آں محترم ملک کے علمی حلقوں میں شہرت کے حامل ہیں اس لیے حدیث وسنت کے بارے میں ان کے اس جدید نظریہ سے بعض پڑھے لکھے بالخصوص ان کے عقیدت کیش اور قریبی تلامذہ متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اس طرح اہل حق کی صف میں حدیث نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کی طرف سے یک

گونہ بے اعتمادی درآئی، جو علم وعقیدہ، دین ومذہب ہر لحاظ سے ایک ناپسندیدہ؛ بلکہ تشویشناک صورت حال تھی، لہٰذا غلامانِ بارگاہ نبوت وپاسبان حریم رسالت کی غلامی وپاسبانی کا تقاضا تھا کہ حدیث وسنت کے پاکیزہ صاف وشفاف اور روشن وتابناک چہرے کے گِرد اٹھائے گئے اس گردوغبار کو دور کریں، چنانچہ علوم نبوت کے ادنیٰ طالب اور بے نوا خادم نے دارالعلوم دیوبند کے بعض قابل قدر ممتاز اساتذہ- جنھیں بندہ اپنے اساتذہ کے درجہ میں باور کرتا ہے- کے مشورہ؛ بلکہ حکم سے دو کتابچے: (۱) ''کیا حدیث حجت نہیں؟'' (۲) ''حجّیت حدیث اور حدیث پر عمل کی صورتیں'' علی الترتیب مرتب کر کے شائع کیے، جنھیں بفضلہٖ تعالیٰ اوساط علمیہ میں بنظر استحسان دیکھا گیا اور توقع سے زیادہ انھیں پزیرائی ملی، اور بفضلہٖ تعالیٰ حجیت حدیث کے دامن سے شکوک وشبہات کی چھینٹیں بڑی حد تک صاف ہوگئیں۔

سال رواں کے رمضان المبارک کی تعطیل کلاں کے ایام گھر گزار کر ماہِ شوال میں جب ''دارالعلوم دیوبند'' حاضر ہوا تو شوال کے اواخر میں ۴۸ صفحات کا ایک رسالہ بنام ''حدیث وسنت میں فرق'' دستیاب ہوا، چونکہ مرتب رسالہ نے اس کے سرورق پر ''از افادات حضرت مولانا سعید احمد پالن پوری دامت برکاتہم ومناظر اسلام حضرت مولانا محمد امین صفدر صاحب اکاڑوی'' لکھ کر بتادیا ہے کہ یہ رسالہ انھیں دونوں بزرگوں کی تحریروں پر مشتمل ہے جن پر بندہ اپنے دونوں کتابچوں میں تفصیل سے بحث کر چکا ہے، نیز اس کے مرتب مولانا مرغوب لاجپوری کون ہیں، ان کا علمی حدود اربعہ کیا ہے، یہاں کے علمی حلقوں میں یہ رسالہ کتنا مؤثر ہوگا یہ سب امور میرے لیے نامعلوم ومجہول تھے، ان وجوہ سے اس کی طرف توجہ نہیں ہوئی اور قریب تھا کہ یہ رسالہ ذہن سے نکل جاتا؛ مگر ماہ ذی قعدہ کے اواخر میں دارالعلوم دیوبند کے ایک فاضل ترین استاذ نے اطلاع دی کی حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب زید مجدہ نے دوران سبق طلبہ کو اس رسالہ کے مطالعہ کی ترغیب دلائی ہے، جن سے قوی امکان ہے کہ طلبہ اسے لے کر پڑھیں گے؛ لہٰذا اس رسالہ کا مطالعہ کر کے اس کے قابل نظر

مندرجات پر نقد وتبصرہ ضروری ہے، تا کہ طلبہ دارالعلوم اس کے مطالعہ سے حدیث پاک کے سلسلے میں اکابرواسلاف کے متوارث عقیدہ کی طرف سے کسی وہم کا شکار نہ ہوجائیں اس لیے بڑوں کے حکم اور کچے ذہن طلبہ کو حدیث رسول ﷺ کی حجیت سے کسی طرح کے تذبذب میں مبتلا ہونے سے بچانے کی غرض سے عیدالاضحیٰ کی تعطیل کے ایام فرصت میں بتوفیق الٰہی یہ تحریر سپرد قلم ہوئی۔ ”وما علینا الا البلاغ“

گو نالہ نارسا ہو، نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہوسکا

والحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلیٰ آلہٖ وصحبہ اجمعین.

حبیب الرحمٰن اعظمی
۲۰/ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ

حجت اور حدیث وسنت کی تعریف

رسالہ ''حدیث اور سنت میں فرق'' مرتبہ مولانا مرغوب احمد لاجپوری کے مندرجات پر نقد ونظر سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تین الفاظ حجت اور حدیث وسنت کے لغوی واصطلاحی معانی کی وضاحت کردی جائے؛ کیونکہ زیرنظر موضوع میں بحث وتحقیق کے اصل محور یہی تینوں الفاظ ہیں اس لیے ان کے معانی ومرادات ذہن نشین ہوجانے کے بعد بہ آسانی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچا جاسکتا ہے اور یہی اس بحث وتحقیق کا مقصود اصلی ہے۔

غالبًا اسی لیے صاحب رسالہ نے بھی اصل موضوع کو حدیث وسنت ہی کی تعریف سے شروع کیا ہے، آں موصوف نے حدیث وسنت کے درمیان فرق ثابت کرنے پر اپنے فکر وقلم کی پوری توانائی صرف کردی ہے اور رسالہ کے سارے صفحات اسی میں ختم کردیے ہیں؛ مگر یہ بتانے کی زحمت نہیں فرمائی کہ حدیث وسنت میں یہ فرق کس قسم کا ہے اور اس فرق سے دونوں کے حکم میں کیا فرق ہوگا؟ جس کی وجہ سے ان کی یہ کاوش قرطاس وقلم نامکمل اور بے نتیجہ ہوکر رہ گئی ہے؛ کیونکہ دونوں کے مابین فرق ثابت ہوجانے کے بعد لامحالہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ ایک مرد مسلم اپنے عقائد واعمال وغیرہ میں حجت ودلیل کسے بنائے حدیث کو یا سنت کو، جبکہ رسالہ میں واضح طور پر اس کا جواب ندارد ہے۔ آں موصوف نے اپنے اسی گریز مخلِ مقصد کی بنا پر لفظ حجت کو بھی نظر انداز کردیا ہے۔

حالانکہ بقول خود انھوں نے اپنے اس رسالہ میں جن دو بزرگوں کی تحریروں سے استفادہ کیا ہے اور انھیں کے فرمودات کو قدرے حذف واضافہ کے ساتھ جمع کردیا ہے ان میں اولین بزرگ نے حدیث وسنت کے مابین فرق اور اس فرق کی نوعیت کو بغیر کسی ابہام وخفا کے نہایت وضاحت اور جزم کے ساتھ اپنے ''علمی

خطبات‘‘ میں بتاکید بار بار بیان کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں ’’علمی خطبات‘‘ میں آں محترم کے فرمودات خود انہی کے الفاظ میں:

۱-’’غرض صحیح بھی حدیث ہے، حسن بھی حدیث ہے اور ضعیف بھی حدیث ہے، مگر حجت سنت ہے، حدیث نہیں‘‘ (ص:۹۲)

۲-ایک ذیلی عنوان ’’حدیث یا سنت کا فیصلہ کون کرے گا‘‘ کے تحت لکھتے ہیں ’’بہر حال حجت سنت ہے حدیث حجت نہیں‘‘ (ص:۹۵)

۳-’’حدیث کے حجت ہونے کی کوئی دلیل نہیں‘‘ (ص:۱۰۲)

۴-’’حدیث اور ہے اور سنت اور ہے اور سنت کو مضبوط پکڑنے کا حکم ہے، حدیث کو نہیں‘‘ (ص۱۰۳)

۵-’’اہل سنت والجماعت کہتے ہیں قرآن کے بعد حدیث حجت نہیں، سنت حجت ہے‘‘ (خطبہ ۴ ص:۱۲۶)

۶-’’جو قرآن کے ساتھ حدیث کو بھی حجت مانتے ہیں، انھوں نے جو فقہ تیار کی ہے وہ بھی برحق نہیں ہے؛ کیونکہ ان کے اصول صحیح نہیں ہیں‘‘ (خطبہ ۴ ص:۱۲۶)

رسالہ ’’حدیث وسنت میں فرق‘‘ کے مؤلف نے اپنے اس استفادہ میں اس نتیجہ خیز وضاحت وبیان سے کیوں گریز کیا؟ اور ناقص ونامکمل استفادہ پر کس غرض سے اکتفاء کیا؟ ہم اس بارے میں کچھ کہنے کا یارا نہیں رکھتے؛ کیونکہ بندوں کے مخفی ارادوں کو جاننے والا صرف اور صرف خدائے عالم الغیب والشہادۃ ہی ہے۔

اس مختصر معروض کے بعد علی الترتیب حجت، حدیث اور سنت کی تعریفات ملاحظہ کیجیے۔

حجت کی تعریف

مولانا قاضی محمد اعلیٰ تھانوی متوفی ۱۱۹۱ھ اپنی مفید ترین تصنیف ’’کشاف اصطلاحات الفنون‘‘ میں لفظ حجت کے تحت لکھتے ہیں: ”الحجة بالضم مرادف

للدلیل کما فی شرح الطوالع“ (ص:۲۸۴مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور۱۴۱۳ھ)

حجت (جیم) کے پیش کے ساتھ دلیل کا مرادف ہے، یعنی حجت ودلیل دونوں ایک معنی میں ہیں۔

امام سید شریف علی جرجانی متوفی ۸۱۶ھ نے اس لفظ کا معنی یہ بیان کیا ہے:

الحجة ما دل به صحة الدعویٰ، وقیل: الحجة والدلیل واحد“

(کتاب التعریفات ص:۳۶مطبوعہ طہران ۱۳۰۶ھ)

جو دعویٰ کی صحت کو بتائے وہ حجت ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حجت ودلیل ایک ہی ہیں۔

حجت کی اس لغوی وفنّی تحقیق کی روشنی میں حجیت حدیث وسنت کا معنی ہوگا:

”انها دلیل علی حکم اللّٰہ یفیدنا العلم، أو الظن به ویُظهره ویکشفه لنا، فإذا علمنا أو ظنناّ الحکم بواسطته وجب علینا امتثاله والعمل به فلذلك قالوا معنی حجة السنة (والحدیث) وجوب العمل بمقتضاها“

اس اجمال کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ بلا کسی تردد کے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ حاکم مطلق وشارع حقیقی صرف اور صرف خدائے وحدہ لاشریک لہ ہی ہے، کسی مخلوق کو اصالۃً یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی دوسری مخلوق پر اپنا حکم چلائے، فرمان الٰہی ہے ”اِنِ الحکمُ اِلَّا لِلّٰہِ“ حاکم تو صرف اللہ ہی ہے، اسی پر جمیع مسلمین کا اتفاق ہے اور اس پر بھی سب کا اجماع ہے کہ باری تعالیٰ کا حکم قطعی طور پر واجب الامتثال ہے، پھر چونکہ حکم الٰہی یعنی خطاب باری تعالیٰ پر اطلاع بغیر کسی دلیل وامارت (علامت) کے ہمارے امکان اور بس میں نہیں ہے، تو خدائے قدوس نے محض اپنے فضل وکرم سے اپنے خطاب وحکم پر قرآن وحدیث وغیرہ کی دلیل وعلامت مقرر فرمادی تاکہ ہمیں اللہ جل شانہ کے احکام کا علم یا ظن حاصل ہوجائے۔

لہٰذا حدیث وسنت کے حجت ہونے کا معنی ومراد یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی دلیل ہے، اسی کے کشف واظہار سے ہمیں اللہ تعالیٰ کے حکم کا علم یا ظن حاصل ہوتا ہے،

توجب حدیث وسنت کے ذریعہ اور واسطہ سے ہمیں باری تعالیٰ کے حکم کا علم یا ظن ہوا، تو اب اس کا امتثال اور اس کے مطابق عمل ہم پر لازم ہوگا، اسی لیے علمائے شرع کہتے ہیں "معنى حجية الحديث وجوب العمل بمقتضاها" حجیت حدیث کا مطلب اس کے مقتضی ومطالبہ پر عمل کرنا ہے۔ (ماخوذ از حجیۃ السنۃ، ص:۲۴۳-۲۴۴، للعلامہ عبدالغنی متوفی ۱۴۰۳ھ)

حدیث کا لغوی معنی

امام ابوالحسن علی بن اسماعیل النحوی اللغوی الاندلسی المعروف بابن سیدۃ المتوفی ۴۵۸ھ کہتے ہیں: الحديث الخبر، قال سيبويه والجمع احاديث" (المخصص، ج۳، ص:۳۲۳)

حدیث بمعنی خبر ہے، اور بقول سیبویہ اس کی جمع احادیث ہے۔

(۲) العلامۃ ابوالقاسم الحسین بن محمد المعروف بابن راغب الاصفہانی المتوفی ۵۰۳ھ اپنی بے نظیر کتاب ''مفردات الفاظ القرآن'' میں لکھتے ہیں:

كل كلام يبلغ الانسان من جهة السمع او الوحى فى يقظته او منامه يقال له حديث... وسمى الله كتابه حديثاً فقال: فَلْيَاْتُوا بَحَدِيُثٍ مِثْلَهٗ"

(والحديث الطرى من الثمار، ص:١٢٤)

ہر وہ کلام جو انسان کو کان یا وحی کے ذریعہ پہنچے بیداری یا نیند میں وہ حدیث ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (یعنی قرآن) کو حدیث فرمایا ہے، تروتازہ پھل (کی تعبیر بھی) حدیث سے کی جاتی ہے۔

(۳) امام لغت علامہ ابن المنظور المتوفی ۷۱۱ھ لسان العرب میں لکھتے ہیں:

الحديث: نقيض القديم، ... والحديث كون الشيء لم يكن، والحديث الخبر، ويأتى على القليل والكثير والجمع احاديث. (ج:۲، ص:۴۳۵ فصل الحاء حرف الثاء)

(الف) حدیث قدیم کا ضد ہے یعنی حادث کے معنی میں ہے، (ب) غیر موجود کا وجود میں آجانا، (ج) بمعنی خیر خواہ تھوڑی ہو یا زیادہ اور اس کی جمع احادیث ہے۔

(۴) علامہ مجدالدین فیروز آبادی متوفی ۸۱۷ھ نے القاموس المحیط میں یہ معنی بیان کیا ہے:

الحدیث: الجدید، والخبر، حدیث جدید اور خبر کے معنی میں ہے
(ص:۲۱۴، مطبوعہ ۱۴۱۶ھ)

(۵) قاضی محمد اعلیٰ تھانوی متوفی ۱۱۹۱ھ نے یہ معنی لکھا ہے:

الحدیث: لغۃً ضد القدیم، ویستعمل فی قلیل الکلام وکثیرہ
(کشاف اصطلاحات الفنون، ج:۱،ص:۲۷۹)

حدیث از روئے لغت قدیم کی ضد ہے، اور تھوڑی وزیادہ بات کے معنی میں مستعمل ہے۔

علمائے لغت کی ان تصریحات کا حاصل یہ ہے کہ لفظ حدیث اہل زبان کے یہاں درج ذیل معنوں میں بولا جاتا ہے۔ خبر، کلام، جدید، نو پید، حادث، تروتازہ پھل وغیرہ۔

حدیث کا اصطلاحی معنی

(۱) شیخ ابوالفیض محمد بن محمد فارسی حنفی معروف بہ فصیح ہروی متوفی ۸۳۷ھ نے حدیث کا اصطلاحی معنی یہ بیان کیا ہے: وفی اصطلاحھم: قول الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، وحکایۃ فعلہ وتقریرہ والسنۃ ترادفہ عندھم. (جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول، ص:۱۰، مطبوعہ المکتبۃ العلمیہ، المدینۃ المنورہ)

علمائے اسلام کی اصطلاح میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور آپ کے فعل وتقریر کی نقل وحکایت کو حدیث کہا جاتا ہے، اور ان کے نزدیک سنت حدیث

کے مرادف ہے۔

(۲) حافظ ابوعبد اللہ بن عبد الرحمٰن محمد سخاوی متوفی ۹۰۲ھ نے حدیث کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

الحديث اصطلاحًا: ما اضيف الى النبى صلى اللّٰه عليه وسلم قولاً له، او فعلاً، او تقريرًا او صفةً حتى الحركات والسكنات فى اليقظة والمنام فهو اعم من السنة... وكثير اما وقع فى كلام اهل الحديث – ومنهم الناظم– ما يدل لترادفهما. (فتح المغیث، ج:۱،ص:۹)

حدیث اصطلاح میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کی نسبت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کی گئی ہو خواہ وہ آپ کا قول ہو یا فعل یا تقریر یا آپ کی صفات حتیٰ کہ بحالت بیداری یا نیند میں حرکت وسکون (اس تعریف کی رو سے) حدیث، سنت سے عام ہوگی، اور علمائے حدیث جن میں ناظم (یعنی الفیۃ الحدیث کے مؤلف حافظ عراقی متوفی ۸۰۶ھ بھی شامل ہیں) کے کلام میں ایسی باتیں آئی ہیں جو حدیث وسنت کے مرادف ہونے کو بتاتی ہیں۔

(۳) نادرۂ عصر مولانا عبدالحئ فرنگی محلی متوفی ۱۳۰۴ھ حدیث کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

واختلف عباراتهم فى تفسير الحديث، فقال بعضهم: ما اضيف إلى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قولاً أو فعلاً أو تقريرًا، أو الى الصحابى، أو إلى التابعى، وحينئذ فهو مرادف السنة، وكثيرا ما يقع فى كلام الحفاظ ما يدل على الترادف، وزاد بعضهم أو صفة ... أيضاً بل الحركات والسكنات النبوية فى المنام واليقظة أيضاً، وعلى هذا فهو اعم من السنة.

(ظفر الامانی مع تعلیق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، ص:۲۴)

حدیث کی تفسیر میں علوم الحدیث کے مصنّفین کی عبارتیں مختلف ہیں، ان میں بعض علماء یوں تعریف کرتے ہیں: وہ قول وفعل وتقریر جن کی نسبت رسول خدا صلی اللہ

علیہ وسلم کی جانب کی گئی ہے، یا صحابی، یا تابعی کی طرف یہ نسبت ہے (وہ حدیث ہے) تعریف کے ان الفاظ کی رو سے حدیث وسنت مرادف ہوں گی، اور حفاظ کے کلام میں بکثرت ایسے استعمالات ہیں جو ان کے مرادف ہونے پر دلالت کرتے ہیں، بعض علماء نے حدیث کی تعریف میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور بحالت نیند وبیداری آپ کی حرکت وسکون کا بھی اضافہ کیا ہے، ان علماء کی تعریف کے لحاظ سے حدیث بمقابلہ سنت عام ہوگی۔

(۴) علامہ طاہر جزائری متوفی ۱۳۳۸ھ اصول حدیث میں اپنی جامع ومفید ترین تصنیف توجیہ النظر میں حدیث کی تعریف بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

الحديث اقوال النبى صلى اللّٰه عليه وسلم وافعاله، ويدخل فى افعاله تقريره، وهو عدم انكاره لامر رآه، أو بلغه عمن يكون منقادًا للشرع، واما ما يتعلق عليه الصلاة والسلام من الاحوال فإن كانت اختياريةً فهى داخلة فى الافعال، وإن كانت غير اختيارية كالحلية لم تدخل فيه اذ لا يتعلق بها حكم يتعلق بنا، وهذا التعريف هو المشهور عند علماء اصول الفقه وهو موافق لفنّهم.

وذهب بعض العلماء إلى ادخال كل ما يضاف إلى النبى صلى اللّٰه عليه وسلم فى الحديث، فقال فى تعريفه: الحديث اقوال النبى عليه الصلاة والسلام وافعاله واحواله، وهذا التعريف هو المشهور عند علماء الحديث وهو موافق لفنّهم، فيدخل فى ذلك اكثر ما يذكره فى كتب السيرة كوقت ميلاده عليه الصلاة والسلام ومكانه ونحو ذلك. (توجیہ النظر الی اصول الاثر مع تعلیق المحقق عبد الفتاح ابوغدہ، ج:۱،ص:۳۷، مطبوعہ بیروت ۱۴۱۶ھ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال (کا نام) حدیث ہے، آپ ﷺ کی تقریر، آپ کے افعال میں داخل ہے، اور تقریر (سے مراد) یہ ہے کہ کسی مسلمان کو آپ نے کوئی کام کرتے ہوئے دیکھا، یا اس کے کام کی اطلاع آپ کو پہنچی اور آپ نے اس کام پر کوئی نکیر نہیں فرمائی، رہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق احوال

تو اگر یہ احوال اختیاری ہیں تو یہ بھی افعال میں داخل ہیں، اور اگر غیر اختیاری ہیں جیسے آپ کا حُلیہ شریفہ تو یہ حدیث میں داخل نہیں ہوں گے؛ کیونکہ ان غیر اختیاری افعال سے کوئی ایسا حکم متعلق نہیں ہے جس کا تعلق ہم امتیوں سے ہو، تعریف کے یہ الفاظ علماء اصول فقہ کے یہاں مشہور ہیں اور یہی ان کے فن کے موافق ہے، اور بعض علماء نے ان سارے امور کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہیں حدیث میں داخل کیا ہے؛ لہٰذا انھوں نے حدیث کی تعریف یہ کی ہے: اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور احوال کا نام حدیث ہے، حدیث کی یہ تعریف علمائے حدیث کے یہاں مشہور ہے اور یہی ان کے فن کے موافق ہے۔ اس تعریف کی رو سے اکثر وہ باتیں جو سیرت کی کتابوں میں ذکر کی جاتی ہیں جیسے آپ کی پیدائش کی تاریخ اور مکان ولادت وغیرہ، حدیث میں داخل ہو جائیں گی۔

علامہ جزائری نے اس موقع پر اس نکتہ کی جانب اشارہ کیا ہے کہ محدثین واصولیین کی تعریفوں میں یہ اختلاف کوئی جوہری اختلاف نہیں ہے؛ بلکہ دونوں طبقہ کے علماء نے اپنے اپنے نقطۂ نظر ودائرۂ عمل کے لحاظ سے حدیث کی تعریف بیان کی ہے، فقہائے اصول رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر اختیاری اقوال وصفات وغیرہ کو بجان ودل عزیز رکھنے کے باوجود اپنے فن کے تحت انھیں حدیث کی تعریف میں داخل نہیں کر سکتے ہیں؛ کیوں کہ ان سے کوئی ایسا حکم متعلق نہیں ہے جس کا تعلق ہم امتیوں سے ہو؛ جبکہ ان حضرات کے فن کا موضوع اور دائرۂ عمل شرعی احکام کے ماخذ ومصادر اور دلائل وحجج سے بحث کرنا ہے، اور حضرات محدثین بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر اقوال وافعال اور تقریرات ہی کو احکام شرعیہ میں حجت ودلیل مانتے ہیں باوجود اس کے چونکہ ان کا مطمح نظر اور موضوع آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب جملہ امور اور ساری باتوں کی حفاظت واشاعت ہے اس لیے ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حدیث کی تعریف میں آپ کے احوال کو بھی داخل کریں، لہٰذا یہ فن وموضوع کے اختلاف کی بناء پر تعبیر کا اختلاف ہے، کوئی حقیقی وبنیادی اختلاف نہیں

ہے۔ الحاصل علمائے حدیث اور علمائے اصول فقہ وغیرہ سب کے نزدیک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، اعمال اور تقریرات کو اصطلاحاً حدیث کہا جاتا ہے اس میں علمائے امت کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث پاک کی یہی تعریف ''رسالہ'' حدیث وسنت میں فرق'' کے صفحات ۹ تا ۱۱ میں بھی بحوالہ علمی خطبات، ج:۱، ص:۶۲۳ مذکور ہے۔

حدیث رسول ﷺ کا حکم

اوپر کی تصریحات سے یہ بات صبح روشن کی مانند ظاہر و واضح ہوگئی کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقریرات ہی کا اصطلاحی نام ''حدیث'' ہے۔

اور اہل سنت والجماعت بلکہ اسلام کی جانب منسوب تمام اسلامی فرقوں کے نزدیک کتاب الٰہی قرآن حکیم کے بعد حدیث رسول (بحثیت حدیث) شرعی احکام میں دلیل وحجت ہے، اس بارے میں علمائے امت کا کوئی اختلاف نہیں ہے؛ بلکہ امام جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ تو لکھتے ہیں: "ان من انکر کون حدیث النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قولاً کان أو فعلاً – بشرطه المعروفة فی الاصول – حجةً کفر وخرج عن دائرة الاسلام" (مفتاح الجنۃ، ص:۲)

بلاشک جس نے حدیث رسول کے خواہ وہ قول ہو یا فعل ہو- اصول میں معروف شرط کے ساتھ- (یعنی وہ حدیث مقبول و معمول بہ ہے اور بغیر کسی تاویل وتوجیہہ کے) حجت ہونے کا انکار کیا تو وہ کفر کا مرتکب ہوا اور دائرہ اسلام سے نکل گیا۔(اعاذنا اللّٰه منه)

سنت کا لغوی معنی

(۱) امام لغت ابوالفتح ناصرالدین مطرّزی متوفی ۶۱۰ھ لفظ سنن کے تحت لکھتے ہیں:

"السنة، الطریقة ومنها الحدیث فی مجوس هَجَر "سُنّوا بهم سنة

اهل الکتاب" الحدیث، ان مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب کے ساتھ کیے گئے طریقہ کے مطابق معاملہ کرو، یعنی جزیہ لے کر امن دینے کا جو معاملہ اہل کتاب کے ساتھ کرتے ہو وہی معاملہ مجوسیوں کے ساتھ کرو۔

(۲) شیخ ابوزکریا محی الدین نووی متوفی ٦٧٦ھ سنت کا معنی یوں بیان کرتے ہیں:

"سنة النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم اصلها الطریقه، وتطلق سنته صلی اللّٰہ علیه وسلم علی الاحادیث المرویة عنه صلی اللّٰہ علیه وسلم، و تطلق السنة علی المندوب، قال جماعة من اصحابنا فی اصول الفقه: السنة، والمندوب، والتطوع، والنفل، والمرغب، والمستحب کلها بمنعی واحد وهو ما کان فعله راجحًا علی ترکه، ولا اثم علی ترکه ویقال: سن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم کذا أی شرعه وجعله شرعاً". (تہذیب الاسماء واللغات، ج:۳،ص:۱۵٦)

سنت کا اصل معنی طریقہ ہے، (الف) اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ (اصطلاح محدثین میں) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی احادیث پر بولا جاتا ہے، (ب) اور سنت کا اطلاق (اصطلاح فقہ میں) مندوب پر ہوتا ہے، ہمارے اصحاب (یعنی فقہائے شوافع) میں سے فقہائے اصول فقہ کی ایک جماعت کا قول ہے کہ سنت، مندوب، تطوع، نفل، مرغب، مستحب سب ایک معنی میں ہیں (یعنی) عمل کا وہ درجہ جس کا کرنا نہ کرنے پر راجح ہے، اور اسے چھوڑ دینے پر گناہ نہیں ہے۔ ویقال: سنن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم کذا یعنی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم نے یوں مشروع کیا اور طریقہ ٹھہرایا ہے۔

(۳) امام ابن المنظور متوفی ۷۱۱ھ نے فن لغت میں اپنی عظیم کتاب "لسان العرب" میں لفظ سنت کی معنوی وشرعی تحقیق ان الفاظ میں نقل کی ہے:

وقد تکرر فی الحدیث ذکر السنة وما تصرّف منها، والاصل فیه الطریقة، والسیرة، وإذا اطلقت فی الشرع فانما یراد بها ما امر به رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم، ونهی عنه، وندب إلیه قولاً وفعلاً مما لم ینطق

به الكتاب العزيز، ولهذا يقال في ادلة الشرع الكتاب والسنة، أي القرآن والحديث. (فصل السين حرف النون، ج:۱۷،ص:۸۹)

سنت اوراس کی تصریفات کا ذکر حدیث میں بار بار آیا ہے، سنت کا اصلی معنی طریقہ وسیرت چال چلن کے ہے، اورشرعی اصطلاح میں سنت سے مراد وہ امور ہیں جن کے کرنے کا حکم نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے قول وفعل سے دیا ہے، یا ان سے منع کر دیا ہے، یا ان کی ترغیب دی ہے۔ اسی بناء پر شریعت (یعنی دینی احکام) کے دلائل (کے ذکر) میں کہا جاتا ہے "الكتاب والسنة" یعنی قرآن وحدیث۔

امام لغت ابن منظور کے الفاظ میں غور کیجیے وہ بتا رہے ہیں کہ شرعی اصطلاح میں لفظ سنت سے مراد وہ اوامر ومناہی اور مندوبات ہیں جن کا ثبوت بجائے قرآن کے نبی معصوم کے قول وفعل یعنی احادیث سے ہوتا ہے۔

سنت سے متعلق امام ابن المنظور کی اس لغوی واصطلاحی تحقیق کو محدث محمد بن طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ نے بھی مجمع البحار، ج:۳،ص:۱۳۱ میں نقل کی ہے۔

(۴) علامہ مجدالدین متوفی ۸۱۷ھ لکھتے ہیں:

والسُنة بالضم: الوجه أو حرّه، أو دائره، أو الصورة، أو الجبهة، والسيرة، والطبيعة، وتمر بالمدينة، وسنة من اللّٰه حكمه وامره ونهيه، وسنن الطريق، نهجه، وجهته. (القاموس المحيط، ص:۱۵۵۸ مطبوعه مؤسسة الرسالة بيروت، الطبعة الخامسة ١٤١٦هـ)

سنت: سین کے ضمہ سے (۱) بمعنی چہرہ، یا چہرہ کا ظاہری حصہ یعنی رخسار، یا چہرہ کا دائرہ، یا صورت کے ہے، (۲) بمعنی سیرت، (۳) بمعنی طبیعت، (۴) مدینہ منورہ کی ایک کھجور کو بھی سنت کہتے ہیں، (۵) اور سنة من اللّٰه سے مراد اللہ تعالیٰ کا حکم، اس کا امر یا نہی، اور سنن الطريق کے معنی راستہ کا نہج اور جہت وسمت ہے۔

علمائے لغت کے مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ لفظ سنت از روئے لغت طریقہ، سیرت، چہرہ، رخسار، صورت، طبیعت، جہت کے معنی میں ہے۔ علاوہ ازیں

عادت اور دوام کے معنی میں بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے؛ البتہ ان میں جوہری و بنیادی حیثیت طریقہ ہی کی ہے بقیہ سارے معانی اسی سے مستفاد ہیں۔ واللہ اعلم

سنت کا اصطلاحی معنی

''سنت'' سے متعلق چونکہ طبقات علماء میں متعدد اصطلاحات رائج ہیں، اور ہر ایک اصطلاح اپنے معنی و مفہوم میں دوسری اصطلاح سے مختلف و مغایر ہے، اس لیے اسلامی علوم وفنون کے مطالعہ کے وقت ان اصطلاحات کے فرق کو ملحوظ رکھنا از بس ضروری ہے؛ کیونکہ ان اصطلاحوں کے معانی کے باہم خلط ہوجانے کی صورت میں صحیح مراد و معانی تک رسائی نہیں ہوسکتی ہے، اس لیے آسانی اور سہولت فہم کے لیے تین مشہور اور عام طور پر کتب اصول حدیث وفقہ وغیرہ میں رائج اصطلاحات کی تعریف الگ الگ نمبروار درج کی جارہی ہے۔

اصطلاح ۱ : علمائے اصول فقہ جن کا اصل موضوع احکام شرعیہ ومسائل فقہیہ کے اصول ودلائل کی بحث وتحقیق ہے، اپنے موضوع کے مطابق احکام شرعیہ فرعیہ کے دلائل اربعہ یعنی کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ، اجماع اور قیاس کا بیان کرتے ہیں، تو کتاب اللہ کے بعد جب دوسری دلیل یعنی سنت رسول اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو وہ سنت کی تعریف رسولِ خدا علیہ الصلاۃ والسلام کے قول، فعل اور تقریر کے الفاظ سے کرتے ہیں بطور نمونہ اصول فقہ کی چند مستند ومعروف ومتداول کتابوں میں سنت کی تعریف ملاحظہ کیجیے:

(۱) قاضی بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ منہاج الوصول الی علم الاصول میں لکھتے ہیں:

"الكتاب الثانى فى السنة: وهو قول الرسول صلى الله عليه وسلم، أو فعله" کتاب ثانی سنت کے بیان میں اور سنت اللہ کے رسول ﷺ کا قول یا فعل ہے۔

منہاج الوصول کے شارح شیخ جمال الدین اسنوی متوفی ۷۷۲ھ قاضی بیضاوی کی بیان کردہ تعریف کی شرح میں لکھتے ہیں:

"اقول: السنة هى العادة والطريقة... وفى الاصطلاح تطلق على ما يقابل الفرض من العبادات، وعلى ما صدر من النبى صلى اللّٰہ عليه وسلم من الافعال، أو الاقوال ليست للاعجاز، وهذا هو المراد ههنا، ولما كان التقرير عبارة من الكف عن الانكار، والكف فعل كما تقدم استغنى عنه به أى عن التقرير بالفعل" (نهاية السول فى شرح منهاج الوصول على هامش التقرير والتحبير، ج:۲، ص:۵۲)

میں کہتا ہوں ''سنت'' لغت میں عادت وطریقہ کے معنی میں ہے اور اصطلاحِ (فقہاء) میں ان عبادتوں پر لفظ سنت بولا جاتا ہے جو فرض کے مقابل ہیں، نیز سنت کا اطلاق (باصطلاح اصولیین) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ان اقوال یا افعال پر ہوتا ہے جو بطور معجزہ کے نہیں ہیں، اور اس موقع پر یہی دوسرا اصطلاحی معنی مراد ہے، اور جب انکار وتردید باز رہنے اور رکنے کو لفظ تقریر سے بیان کیا جاتا ہے، تو چونکہ یہ ''کف'' یعنی باز رہنا ایک فعل ہے، جیسا کہ اس کا بیان ہو چکا ہے، تو مصنف نے افعال کے ذکر کے بعد (الگ) سے تقریر کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی۔

(۲) فقیہہ اصولی علامہ عضدالدین ایجی متوفی ۷۵۶ھ مختصر ابن الحاجب کی شرح میں لکھتے ہیں:

"ما صدر عن سيدنا محمد رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم غير القرآن من فعل أو قول أول تقرير"

''سنت'' سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔قرآن کے علاوہ۔ صادر فعل یا قول یا تقریر ہیں'' اصول فقہ کی معروف کتاب ''تلویح'' میں بھی یہی تعریف ہے۔ (بحوالہ کشاف اصطلاحات الفنون، ج:۱،ص:۷۰۳)

محقق ابن ہمام متوفی ۸۶۱ھ نے بھی یہی تعریف نقل کی ہے (التقرير والتحبير شرح التحرير، ج:۲، ص:۲۲۳)

غرضیکہ اصول فقہ کی جملہ کتابوں میں ادلۂ اربعہ (فقہ کے دلائل چہارگانہ) کے

ضمن میں سنت کی یہی تعریف دیکھی جاسکتی ہے، علمائے حدیث بھی سنت کی یہی تعریف کرتے ہیں چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ فتح الباری شرح البخاری میں لکھتے ہیں:

المراد ... بالسنة ما جاء عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم من اقواله وافعاله وتقریره وما هَمّ بفعله، والسنة فی اصل اللغة الطریقة وفی اصطلاح الاصولیین والمحدثین ما تقدم (کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، ج:١٣، ص:٣١٦)

سنت سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیش آئے اقوال وافعال، تقریرات نیز آپ کا ارادۂ فعل ہیں اور اصل لغت میں سنت بمعنی طریقہ ہے اور اصولیوں ومحدثین کا اصطلاحی معنیٰ یہی ہے جو اوپر گذرا۔

علامہ بدرالدین عینی متوفی ۸۵۵ھ نے بھی عمدۃ القاری شرح البخاری باب اقتداء السنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح کرتے ہوئے سنت کا یہی مذکورہ معنی ذکر کیا ہے۔ (ج:۲۵،ص:۲۵)

علامہ طاہر جزائری متوفی ۱۳۳۸ھ توجیہ النظر، ج:۱،ص:۴۰ میں سنت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”والسنة: فتطلق فی الاکثر علی ما اضیف إلی النبی علیه الصلاة والسلام من قول أو فعل أو تقریر، فهی مرادفة الحدیث عند علماء الاصول“

سنت کا اکثر اطلاق اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب قول یا فعل یا تقریر پر ہوتا ہے؛ لہٰذا سنت علمائے اصول کے نزدیک حدیث کے مرادف ہے۔

''حدیث وسنت'' کی مذکورہ بالا تعریفوں سے نصف النہار کی طرح ظاہر ہو گیا کہ علماء اصول اور حضرات محدثین کی اصطلاح میں حدیث وسنت مرادف ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں ہے؛ کیونکہ علمائے حدیث واصول دونوں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل، تقریر کی تعبیر حدیث وسنت سے کرتے ہیں اور حدیث وسنت کے مابین اسی ترادف کی تصریح حافظ ابن حجر، علامہ فصیح ہروی، حافظ سخاوی، مولانا

عبدالحئ فرنگی محلی، علامہ طاہر جزائری وغیرہ محققین علمائے حدیث واصول نے کی ہے۔اس لیے زوال علم کے اس عہد میں جو مناظرہ پسند علما، علی الاطلاق حدیث وسنت کے درمیان فرق کے مدعی ہیں ہوسکتا ہے دلیل سے کورے اس دعویٰ پر انھیں عوامی جلسوں میں تحسین وستائش کی داد مل جائے، ورنہ علم وتحقیق کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں ہے۔

حدیث پاک ہی کی طرح یہ مصطلحہ سنت بھی احکام شرعیہ میں حجت ہے؛ بلکہ محقق ابن ہمام تو صراحت کرتے ہیں کہ اس کی حجیت ضروریات دینیہ میں سے ہے (تیسیر التحریر، ج:۳،ص:۲۲)

مقام حیرت ہے کہ کتابچہ ''حدیث وسنت میں فرق'' کے مرتب اس کثیر الاستعمال اور علمائے اصول کے فکر وعمل کی محور اس سنت سے اس طرح نظر بچا کر گذر گئے گویا اسلامی علوم وفنون میں اس کا وجود ہی نہیں، آخر اس مصطلحہ ۱ سنت کی جانب سے یہ بے اعتنائی کیوں برتی گئی؟ ممکن ہے کہ اس کا ذکر وبیان ان کے خلاف مقصد ہو، اسی بنا، پر اسے نظر انداز کر دیا گیا ہو، واللہ اعلم بسرائر قلوب العباد۔

اصطلاح ۲ : فقہائے اسلام نے عبادتوں کے درجات بیان کرتے ہوئے مرتبہ کے لحاظ سے جو عبادت فرض وواجب کے بعد ہوتی ہے اس کو سنت سے تعبیر کرتے ہیں، چنانچہ نصاب درس میں شامل اصول فقہ کی متداول معروف کتاب ''حسامی''میں فقہ حنفی کی رو سے سنت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

(۱) ”والسنة: الطريقة المسلوكة فى الدين، وحكمها أن يطالب المرء باقامتها من غير افتراض ولا وجوب، لانها طريقة امرنا باحيائها، فنستحق اللائمة بتركها“ (ص:۵۹)

سنت دین میں چلا ہوا طریقہ (کا نام) ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ مرد مسلم سے- بغیر فرض وواجب ٹھہرائے- اس کے قائم کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا؛ کیونکہ یہ ایسا طریقہ ہے جس کے زندہ (یعنی جاری) رکھنے کے ہم مامور ہیں؛ لہٰذا اس کے ترک پر

ہم مستحق ملامت ہوں گے۔

"الطریقة المسلوکه" کی مراد بیان کرتے ہوئے کتاب کے محشی مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی متوفی ۱۲۸۵ھ لکھتے ہیں: "المراد من الطریقة المسلوکة" الطریقة الحسنة التی سلکها النبی صلی الله علیه وسلم والصحابة مطالبًا بها" (حاشیه ۳۲، ص:۱۶۶) طریقۂ مسلوکہ سے مراد وہ بہتر اور اچھا طریقہ ہے جس پر نبی علیہ الصلاۃ والسلام اور صحابہ چلے ہیں اس پر چلنے کا مطالبہ کرتے ہوئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ طریقۂ مسلوکہ ہونے کے لیے دوام واستمرار شرط نہیں ہے۔

(۲) فقیہہ محدث محقق ابن ہمام نے یہ تعریف کی ہے:

"وفی فقه الحنیفة: ما واظب علی فعله مع ترك ما بلا عذر" (التقریر والتحبیر شرح التحریر، ج:۲، ص:۲۲۳)

اور فقہ حنفی میں سنت وہ ہے جس کے کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا عذر کبھی کبھار ترک کے ہمیشگی فرمائی ہے۔

(۳) امام ابوالیسر محمد بن محمد البزدوی متوفی ۴۹۳ھ نے سنت زیر بحث کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

أما السنة: فکل نفل واظب علیه رسول الله صلی الله علیه وسلم مثل التشهد فی الصلاة، وسنن الرواتب، وحکمها ان یندب إلی تحصیلها ویلام علی ترکها مع لحوق اثم یسیر" (کشف الاسرار شرح کنز الوصول إلی معرفة الاصول المعروف به اصول بزدوی، ج:۲، ص:۵۶۳)

اور سنت تو وہ نفل (عبادت زائدہ) ہے جس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشگی فرمائی ہے جیسے نماز میں تشہد اور فرائض کے ساتھ پڑھی جانے والی سنتیں، اس کا حکم یہ ہے کہ اس کی تعمیل کی ترغیب دی جائے گی اور اس کا چھوڑنا ملامت وسرزنش کے ساتھ تھوڑے سے گناہ کا باعث ہوگا۔

معروف شافعی محدث وفقیہہ شیخ محی الدین نوویؒ کی عبارت سنت کی لغوی تحقیق

کے تحت گزر چکی ہے جس میں انھوں نے فقہ شافعی کی رو سے سنت کا تعارف یوں نقل کیا ہے:

وتطلق السنة على المندوب: قال جماعة من اصحابنا فى اصول الفقه: السنة والمندوب، والتطوع والنفل والمرغّب والمستحب كلها بمعنى واحد، وهو ما كان فعله راجحاً على تركه، ولا اثم على تركه"

(تهذيب الاسماء واللغات، ج:٣، ص:١٥٦)

سنت (کا لفظ فقہ میں) مندوب پر بولا جاتا ہے، ہمارے اصحاب شوافع میں سے فقہائے اصول کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ سنت، مندوب، تطوع، نفل، مرغّب اور مستحب سب ایک معنی میں ہیں یعنی عبادت کا وہ درجہ جس کا کرنا نہ کرنے پر راجح ہو اور اس کے چھوڑ دینے پر گناہ نہیں ہے۔

فقہ اسلامی کا طالب علم بخوبی جانتا ہے کہ دین اسلام میں یہ سنت اگر چہ فرض واجب نہیں ہے پھر بھی اس کا بجالانا مطلوب و مرغوب ہے اور اس کا بلا عذر ترک لائق مذمت؛ بلکہ فقیہ اصولی امام ابوالیسر کے نزدیک باعث گناہ یسیر ہے، بایں ہمہ اس کا باب حجیت اور شرعی حکم کی دلیل ہونے سے کوئی تعلق نہیں؛ کیونکہ یہ خود اپنے ثبوت میں رسول خدا علیہ الصلاۃ والسلام کے قول وفعل یعنی حدیث نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کی محتاج ہے، تو یہ کسی حکم شرعی کی حجت ودلیل کیوں کر بن سکتی ہے، الحاصل حدیث نبوی اور سنت فقہی میں کوئی مقابلہ نہیں ہے کہ کہا جائے حدیث وسنت میں فرق ہے۔ فافہم

اصطلاح ۳: اللہ کے نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی احادیث اور حضرات صحابہ وتابعین کے کلام میں وارد لفظ سنت جبکہ اس کی اضافت ونسبت آپ ﷺ کی جانب ہو مثلاً عليكم بسنتي يا سنة نبيكم، یا موقع استحسان وطلب میں ہو تو وہ اصطلاح شرع میں "الطريقة المسلوكة المتبعة فى الدين" کے معنی میں ہوتا ہے، چنانچہ کتابچہ ''حدیث وسنت میں فرق'' کے مرتب نے بھی زیر بحث سنت کی تعریف

”الطريقة المسلوكه فی الدين“ ہی کے الفاظ سے کی ہے۔ (دیکھئے کتابچہ مذکورہ، ص:۱۱-۱۲)

اس اصطلاح میں سنت اللہ تعالیٰ کے فرمان- ”ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا“ پھر رکھا ہم نے تجھ کو دین کے ایک راستہ پر سو تو چل اسی پر- میں وارد لفظ شریعت کے معنی میں ہے، قاضی محمد اعلیٰ تھانوی نے کشاف اصطلاحات فی الفنون میں صراحت کی ہے کہ شرع میں لفظ سنت بمعنی شریعت استعمال ہوتا ہے چنانچہ سنت کے معنی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”وفی الشريعة تطلق علی معان، منها الشريعة، وبهذا المعنى وقع فی قولهم ”الاولیٰ بالامامة الاعلم بالسنة“ (ج:۱،ص:۷۰۳)

نیز ثم جَعَلْنَاكَ علی شريعة کی تفسیر امام ابن جریر طبری نے علی طريقة، وسنت، ومنهاج کے الفاظ سے کی ہے۔ تفسیر (جامع البیان، ج:۱۳،ص:۱۱۹) جس سے معلوم ہوا کہ شریعت، سنت، طریقہ، منہاج وغیرہ الفاظ ایک ہی مفہوم میں ہیں۔

اور خدائے احکم الحاکمین کی مقرر کردہ اس شریعت پر بحکم خداوندی آپ ﷺ اور آپ کی اتباع میں صحابۂ کرام بالخصوص خلفائے راشدین پوری طرح عمل پیرا رہے۔

یہ سنت وشریعت قرآن وحدیث سے ماخوذ تمام دین کو حاوی ہے، جس میں اعتقادات، اعمال، اخلاق وآداب وغیرہ دین کا مکمل اور پورا مجموعہ شامل ہے، پھر یہ اعتقادات واعمال وغیرہ مرتبۂ فرضیت کے حامل ہوں، یا وجوب وسنت اور استحباب واباحت کے درجہ میں ہوں یا حرمت وکراہت کا حکم رکھتے ہوں۔ اس طریقہ مشروعہ متبعہ یعنی اس مصطلحہ سنت میں داخل ہیں، چنانچہ کتب ستہ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ) وغیرہ دواوین اسلام کے شارح محدثِ فقیہہ علامہ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندھی ثم مدنی متوفی ۱۱۳۸ھ سنن ابن ماجہ کے اولین باب ”اتباع سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح میں لکھتے ہیں:

(قوله اتباع سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم) يحتمل انه اراد

بالسنة احد الادلة الاربعة المذكورة فى كتب الاصول، وهى الكتاب والسنة، واجماع الامة والقياس، والسنة بهذا المعنى تشمل قوله صلى اللّٰه عليه وسلم وفعله وتقريره، فكل ذلك من الادلة تثبت بها الاحكام الشرعية، ويجب على الناس اتباعها، واتباع السنة بهذا المعنى الاخذ بمقتضاها فى تمام الاحكام الدينية من الاباحة والوجوب، والحرمة والندب والكراهة.

ويحتمل انه اراد بالسنة الطريقة المسلوكة له صلى اللّٰه عليه وسلم فيشمل تمام الدين سواءٌ ثبت بالكتاب اوالسنة، واتباع السنة بهذا المعنى هو الاخذ بها، والسنة بالمعنى الاول من اقسام الدليل، وبالمعنى الثانى هو المدلول، واحاديث الباب تناسب لمعنين فى الجملة الخ (سنن المصطفى المعروف بسنن ابن ماجه مع حاشية الشيخ الفاضل السندیؒ المطبوعة بالطبعة الحازيه بمصر الطبعة الاولیٰ بغير التاريخ، ص:۳)

مصنف (یعنی امام ابن ماجہ) کے قول "اتباع سنة رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم" **میں (ایک) احتمال یہ ہے کہ انھوں نے ''سنت'' سے مراد کتب اصول میں مذکور دلائل چہارگانہ میں سے ایک دلیل لی ہو، یہ دلائل: کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع امت اور قیاس ہیں۔ لفظ سنت اس معنی میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل، تقریر کو شامل ہوگا، پس یہ سب من جملہ دلائل ہیں جن سے شرعی احکام ثابت ہوتے ہیں اور لوگوں پر ان کی اتباع و پیروی واجب ہے، اتباع سنت اس معنی میں: جملہ احکام دینیہ یعنی اباحت، وجوب، حرمت، مستحب، کراہت میں سنت کے مقتضی و مطالبہ کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔**

اور (دوسرا) احتمال یہ ہے کہ مصنف نے سنت سے مراد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ مسلوکہ لیا ہو، لفظ سنت اس معنی میں تمام دین کو شامل ہوگا، اس کا ثبوت خواہ اللہ کی کتاب سے ہوا ہو یا رسول اللہ کی حدیث وسنت سے، اتباع سنت اس

صورت میں بعینہٖ اس سنت وطریقۂ مسلوکہ کی پیروی ہوگی۔

سنت پہلے معنی کے اعتبار سے (احکام شرعیہ کی) دلیل کی قسموں میں سے (ایک قسم) ہوگی اور دوسرے معنی کے لحاظ سے (کسی دلیل کی) مدلول ہوگی، یعنی قرآن وحدیث کی دلیل وحجت سے ثابت کوئی حکم ہوگا، اس باب کے تحت (مذکور) حدیثیں فی الجملہ دونوں معنی سے مناسبت رکھتی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ عبارت زیر شرح میں وارد ''سنت'' اپنے معنی میں پورے مجموعہ دین کو حاوی ہے، جن میں عقائد، اعمال، اخلاق وغیرہ سارے دینی احکام الطریقة المسلوكه فی الدین میں داخل ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ تمام اسلامی احکام صرف احادیث ہی سے ثابت نہیں ہیں، ان میں سے ایک قابل قدر حصہ کا ثبوت کتاب اللہ سے ہوا ہے، اس کے باوجود چونکہ نبی مرسل علیہ الصلاۃ والسلام کے قول وعمل سے ان کا راست تعلق ہے اسی نسبت خاص کی بناء پر اس طریقۂ مسلوکہ، اور شریعت اسلامی اور دینی منہج کو سنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس سنت (یعنی الطريقة المسلوكه) کی مکمل اتباع وپیروی کا ہر ہر فرد مسلم مکلّف ہے، دین اسلام کے ساتھ بے لوث وفاداری اسی سنت مسلوکہ متبعہ کی بجا آوری میں منحصر ہے، اسی لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو مختلف اسلوب اور پیرائے میں کثرت سے اس کے تمسک اور مضبوطی وثابت قدمی کے ساتھ اس کی پیروی کا حکم دیا ہے، بایں ہمہ یہ مصطلحہ سنت (الطريقة المسلوكه) اپنے اندر دلیل وحجیت کا معنی نہیں رکھتی ہے؛ بلکہ بجائے خود یہ قرآن وحدیث کے دلائل کی مدلول ہے، اتباع وپیروی ایک الگ چیز ہے اور کسی بات کی دلیل وحجت ہونا یہ شئے آخر ہے، دونوں میں کوئی اشتباہ واشتراک نہیں ہے۔

زیر عنوان سنت کے مفہوم ومراد کی مزید توضیح وتفہیم کے لیے ایک حوالہ اور نقل کیا جارہا ہے تاکہ بات اچھی طرح ذہن نشیں ہوجائے، ایک ہی مسئلہ سے متعلق متعدد تعبیرات کے مطالعہ سے فہم مسئلہ میں بڑی سہولت ہوجاتی ہے۔ رسول خدا صلی

اللہ علیہ وسلم کی پاک حدیث "مَن يعش منكم بعدى فسيرى اختلافًا كثيرًا فعليكم بسنتى، وسنة الخلفاء الراشدين المهديين" الحديث.

''میرے بعد تم میں جو زندہ رہے گا وہ اختلاف کثیر دیکھے گا (اس صورت حال میں) تم لوگ میری سنت (طریقہ) اور خلفائے راشدین المہدیین کی سنت (طریقہ) کولازم پکڑنا'' کی تشریح وتفصیل کرتے ہوئے حافظ ابن رجب حنبلی متوفی ۷۹۵ھ لکھتے ہیں:

"هذا اخبار عنه صلى اللّٰه عليه وسلم بما وقع فى امته بعده من كثرة الاختلاف فى اصول الدين وفروعه وفى الاعمال والاقوال والاعتقادات هذا موافق لما روى عنه صلى اللّٰه عليه وسلم من افتراق امته على بضع وسبعين فرقةً وانها كلها فى النار الا فرقة واحدة، وهى ما كان عليه هو واصحابه، ولذلك فى هذا الحديث امر عند الافتراق والاختلاف بالتمسك بسنته وسنة الخلفاء الراشدين من بعده.

والسنة هى الطريق المسلوك، فيشمل ذلك التمسك بما كان عليه هو وخلفاؤه الراشدون من الاعتقادات، والاعمال، والاقوال وهذه السنة الكاملة، ولهذا كان السلف قديماً لا يطلقون اسم السنة الا ما يشمل ذلك كله، وروى معنى ذلك عن الحسن، والاوزاعى، والفضيل بن عياض" (جامع العلوم والحكم، ص۲۵۷ مطبوعه مؤسسة الكتب الثقافية، بيروت الطبعة الثانية ۱۴۱۰هـ/۱۹۹۰ء)

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ اس اختلاف کثیر کی پیشین گوئی ہے، جو آپ کے بعد امت میں دین کے اصول وفروع، اعمال، اقوال، اعتقادات (وغیرہ) میں واقع ہوا، یہ حدیث آپ سے مروی اس حدیث کے موافق ہے جس میں امت کے ستر سے اوپر فرقوں میں بٹ جانے اور بجز ایک فرقہ کے جو آپ ﷺ کے اور صحابہ کے طریقہ پر ہوگا سب فرقوں کے جہنمی ہونے کی خبر دی گئی ہے، اسی بنا پر اس

حدیث میں اس افتراق واختلاف کے وقت اپنی سنت اور خلفائے راشدین کی سنت پر تمسّک اور قوت ومضبوطی کے ساتھ عمل کا حکم دیا ہے، اور (اس حدیث میں وارد لفظ) سنت بمعنی طریق مسلوک ہے، لہٰذا یہ تمسک ان سب اعتقادات واعمال واقوال کو شامل ہوگا جس پر آں حضرت علیہ الصلاۃ والسلام اور خلفائے راشدین تھے، اور سنت بایں معنی سنت کاملہ اور طریق مکمل ہے، اسی لیے زمانۂ قدیم میں اسلاف سنت کا اطلاق اسی دینی طریقہ پر کرتے تھے جو اوپر مذکور سارے امور پر مشتمل ہوتا تھا، امام حسن بصری، امام اوزاعی اور امام فضیل بن عیاض سے (بالخصوص) سنت کا یہی عمومی معنی منقول ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حدیث میں وارد سنت معنیً پورے مجموعہ دین کو حاوی ہے جن میں عقائد، اعمال، اخلاق وغیرہ خواہ یہ فرض ہوں یا واجب وسنت اور مستحب ومباح اور حلال وحرام، مکروہ وغیرہ سارے دینی احکام ”الطریقة المسلوکة المشروعة المتبعة فی الدین“ میں داخل ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ تمام احکامات صرف احادیث وسنن ہی سے ثابت نہیں ہیں؛ بلکہ ان میں سے ایک قابل قدر حصہ کا ثبوت کتاب الٰہی اور قرآن محکم سے ہوا ہے، چونکہ نبی مرسل علیہ الصلاۃ والسلام نے اپنے قول وعمل سے ان کو بیان کیا ہے، اسی نسبتِ خاص کی رعایت میں انھیں سنت سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ سنت (یعنی الطریقة المسلوکة) بھی اپنے اندر دلیل وحجیت کا معنی نہیں رکھتی ہے؛ بلکہ بجائے خود قرآن وحدیث کے دلائل کی مدلول ہے۔ جیسا کہ ان دونوں حوالوں سے واضح ہے۔

یاللعجب! آج نبی معصوم کی حدیث مقدس کو جس کی حجیت جملہ شکوک وشبہات سے پاک وصاف اور بالاتر ہے، جس کی حجیت پر امت کے تمام طبقات اور فرقوں کا اتفاق ہے، اسی حدیث کے بارے میں کہا جارہا ہے ”حدیث کے حجت ہونے کی کوئی دلیل“، ”بہرحال حجت سنت ہے، حدیث حجت نہیں“ (بلفظہ) اور اسی حدیث سے فی الجملہ ثابت سنت (بمعنی الطریقة المسلوکه) کو حجت بتایا جارہا ہے،

اسے قدرت کی کرشمہ سازی نہیں تو پھر کیا کہا جائے گا کہ ایک ایسی شخصیت جس کی اب تک کی زندگی اسلامی علوم وفنون کے جلو میں گزری ہے، درس وتدریس، تصنیف وتالیف جس کا خاص مشغلہ ہے، آج اسی کے فہم وفکر کی گنگا الٹی بہہ رہی ہے "کُلّ یَومٍ هُو فِی شَأْنٍ"

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے

حافظ ابن رجبؒ کی اس تشریح وتفصیل سے بلکہ خود حدیث پاک میں بھی اس کا اشارہ ہے کہ اس سنت (الطريقة المسلوكه) کا اطلاق بدعت کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ مشہور یمنی عالم قاضی محمد شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ سنت کی مختلف اصطلاحات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وتطلق على ما يقابله البدعة" (ارشاد الفحول، ج:۱، ص:۹۵) اور سنت کا اطلاق اس معنی پر ہوتا ہے جس کا مقابل بدعت ہے۔

اور قاضی شوکانی سے پہلے امام شاطبی متوفی ۷۹۰ھ اس کی تصریح کر چکے ہیں: چنانچہ اپنی بینظیر کتاب الموافقات میں رقمطراز ہیں:

"ويطلق ايضاً فى مقابلة البدعة، فيقال: فلان على سنة، اذا عمل على وفق ما عمل النبى صلى الله عليه وسلم، كان ذلك مما نصّ عليه فى الكتاب اولا، ويقال: فلان على بدعة، اذا عمل على خلاف ذلك، وكأنّ هذا الاطلاق انما اعتبر فيه عمل صاحب شريعة فاطلق عليه لفظ السنة من تلك الجهة وإن كان العمل بمقتضى الكتاب" (ج:٤، ص:٣)

لفظ سنت بمقابلہ بدعت بھی بولا جاتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: فلاں سنت پر ہے جبکہ اس کا عمل اس طریقہ کے موافق ہو جس کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے، یہ طریقہ چاہے ان طریقوں میں سے ہو جو قرآن میں منصوص ومصرح ہیں، یا ایسا نہ ہو (یعنی وہ قرآن کے بجائے حدیث وسنت سے ثابت ہو) اور کہا جاتا ہے فلاں بدعت پر ہے جبکہ وہ مذکورہ طریقہ کے خلاف عمل کرے، گویا لفظ سنت کے اطلاق میں

صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کا لحاظ کیا گیا ہے (یعنی عمل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بناء پر اس کی تعبیر سنت سے کی گئی ہے اگر چہ یہ عمل بمقتضائے قرآن ہے۔)

اسی بناء پر اہل اسلام کی وہ جماعت جس نے اپنے دینی طرز عمل میں "ما انا علیہ واصحابی" اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم وسنت خلفائے راشدین کا مکمل اہتمام والتزام کیا، اس راہ سے منحرف ومبتدع فرقوں کے بالمقابل "اہل سنت والجماعت" کے توصیفی نام سے موسوم ہوئی، گویا اس تلقیب وتسمیہ میں بھی سنت بمعنی الطریق المسلوک فی الدین ہی ہے، کوئی دوسری مصطلحہ سنت نہیں ہے۔ "فتدبر"

"حجت" اور حدیث وسنت کی لغوی واصطلاحی تحقیق وتنقیح سے متعلق یہ تحریر بفضلہٖ تعالیٰ ان سطور پر مکمل اور پوری ہوگئی، یہ بحث اگر چہ اندازہ سے زیادہ طویل ہوگئی پھر بھی فائدے سے خالی نہیں ہے، بالخصوص "علوم الحدیث" کے طلبہ کے لیے زیر گفتگو مسئلہ کی تفہیم میں یہ بڑی معاون ہوگی جس کا اندازہ اس کے بغور مطالعہ کے بعد انھیں خود ہو جائے گا (ان شاء اللہ العزیز) اب ایک نظر میں اس بحث وتحقیق کا خلاصہ ملاحظہ کرتے چلیں۔

خلاصۂ بحث

(۱) "حجت" لغت میں "دلیل" کو کہتے ہیں، لہٰذا حجیت حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حدیث پاک حکم خداوندی کی مظہر ودلیل ہے۔

(۲) "حدیث" اللہ کے نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل اور تقریر کا اصطلاحی نام ہے، اور آپ کے قول وفعل اور تقریر کی حجیت علماء امت کے نزدیک مسلمات میں سے ہے اس لیے حدیث کے حجت ہونے پر کیا کلام ہوسکتا ہے؟

(۳) سنت باصطلاح ۱ ؎ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر ہی کو کہتے ہیں، اس لیے سنت وحدیث مرادف اور ہم معنی ہیں ان میں کوئی فرق نہیں ہے، لہٰذا حدیث کی طرح یہ بھی دلیل وحجت کے معنی سے متصف ہوگی۔

(۴) سنت اصطلاح ۲ کے اعتبار سے ایک شرعی عبادت کا نام ہے جس کا درجہ فرض واجب کے بعد اور (فقہائے احناف کے قول کے مطابق) نفل سے پہلے کا ہے، چنانچہ (مثلاً) ظہر کے فرض سے پہلے چار رکعتوں اور بعد از فرض دو رکعتوں پر مشتمل نماز کو اسی اصطلاح کے بموجب عرف عام میں بھی سنت ہی کہا جاتا ہے، اس میں سنت میں دلیل و حجت کا معنی نہیں ہے؛ بلکہ خود اس کا ثبوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کی دلیل سے ہوا ہے۔

(۵) سنت اصطلاح ۳ کے لحاظ سے "الطریقۃ المسلوکہ فی الدین" کے مفہوم میں ہے، یعنی قرآن و حدیث سے ثابت وہ جادۂ اسلام اور طریقۂ دین جس پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ چلتے تھے، اس جادۂ نبوی اور طریقہ خلفائے راشدین، وصحابۂ کرام کی اتباع و پیروی ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے، اس سے منحرف ہو کر کوئی نو پید خود تراشیدہ طریقہ اختیار کرنا احداث فی الدین اور ابتداع ہے جو عند اللہ والرسول مردود و مبغوض ہے، یہ لفظ سنت بالعموم بدعت کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سنت میں بھی حجت و دلیل ہونے کی صفت نہیں ہے؛ کیونکہ اس کا ثبوت و اظہار بجائے خود قرآن و حدیث کے دلائل سے ہوتا ہے، جیسا کہ "الطریقۃ المسلوکہ" کے الفاظ بھی یہی بتا رہے ہیں؛ کیونکہ جادہ و راستہ از خود وجود میں نہیں آتا ہے؛ بلکہ کسی کے مقرر کرنے سے منصۂ شہود میں آتا ہے۔

اب آئندہ سطور میں کتابچہ ''حدیث وسنت میں فرق'' کے مندرجات و مشمولات پر ایک نظر ڈالی جا رہی ہے۔

(۱) ''حدیث وسنت میں فرق'' ظاہر ہے یہ ایک دعویٰ ہے، مگر اس دعویٰ کی کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی ہے، جبکہ مرتبِ کتابچہ ماشاء اللہ ایک صاحبِ درس عالم ہیں اور بقول خود حدیث و تفسیر وغیرہ اسلامی علوم کی اعلیٰ ترین کتابوں کے درس کا انھیں شرف میسر ہے، اس لیے وہ بخوبی جانتے ہوں گے کہ ارباب علم و فن ہی نہیں؛ بلکہ اصحاب عقل و ہوش کے دعوں کی پشت پر دلائل کی قوت و طاقت ہوا کرتی ہے، کیونکہ جہانِ علم

وفن میں دعویٔ بلا دلیل لائق اعتبار اور قابل التفات تصور نہیں کیا جاتا ہے، شاید ان کا خیال ہو کہ ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' اسی لیے دلیل دینے کی ضرورت نہ سمجھی ہو۔

(۲) ''حدیث وسنت'' کے اس مبینہ فرق میں انھیں پہلے ہی اس کی وضاحت کر دینی چاہیے تھی کہ سنتِ مذکورہ سے ان کی مراد از روے اصطلاح وعرف فلاں سنت ہے، کیونکہ اصطلاحی اعتبار سے سنت مختلف معانی میں مستعمل ہے۔ یا پھر یہ بتا دینا چاہیے تھا کہ ان کے نزدیک سنت کا مطلقاً (اپنے کل معنوں میں) حدیث سے فرق ہے، اس وضاحت کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کی بات میں ابہام در آیا ہے، کیا ایسا تو نہیں ہے کہ یہ ابہام واشتباہ ہی اس موقع پر ان کے مفید مطلب ہو اس لیے دانستہ اسے اختیار کیا گیا ہے ''دیوانہ سمجھ بوجھ کے دیوانہ بنا ہے''۔

(۳) یہ فرق کس بات میں ہے اس کے اظہار وبیان سے بھی ان کا اشہب قلم کشاں کشاں گزر گیا ہے، اپنے موضوع کے ان اہم توضیح طلب پہلوؤں سے اس گریز سے ان کا قاری فرط حیرت سے پکار اٹھتا ہے کہ ''یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے'' کہ بیان ہو رہا ہے حدیث وسنت میں فرق کا اور اس قدر ابہامات کے ساتھ، کہ نہ یہ بتایا گیا کہ سنت کی مختلف قسموں میں سے کس قسم کا حدیث سے یہ فرق ہے اور نہ یہ بیان کیا گیا کہ یہ فرق کس امر میں ہے، ان ابہامات اور پوشیدگیوں کو دور کیے بغیر یہ فرق منقح کیوں کر ہوگا آخر ان پردہ داریوں کا کیا مقصد ہے؟

(۴) البتہ اتنی زحمت ضرور کی گئی ہے کہ اپنے طور پر حدیث وسنت میں فرق کی نوعیت بیان کر دی ہے، مگر اس بیان میں بھی قریب کے مآخذ کو چھوڑ کر دور کی کوڑی لائی گئی ہے، چنانچہ ''حدیث اور سنت میں نسبت'' کا عنوان قائم کر کے اس کے تحت لکھتے ہیں:

''حدیث اور سنت نہ تو دونوں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں، یعنی دونوں میں تباین کی نسبت نہیں ہے، اور نہ دونوں ایک ہیں، یعنی دونوں میں تساوی کی نسبت بھی نہیں ہے؛ بلکہ خاص وعام من وجہ کی نسبت ہے، اور جہاں یہ نسبت ہوتی ہے وہاں تین مادے ہوتے ہیں دو افتراقی اور ایک اجتماعی، جیسے سفید اور حیوان میں من وجہ کی

نسبت ہے، اور مادہ افتراقی سفید کپڑا اور کالی بھینس ہیں اوّل صرف سفید ہے اور ثانی صرف حیوان، اور سفید بیل مادہ افتراقی ہے (رسالہ میں یونہی ہے غالبًا یہ کتابت کی غلطی ہے مادہ افتراقی کے بجائے مادہ اجتماعی ہونا چاہیے) وہ سفید بھی ہے اور حیوان بھی۔ حدیث وسنت کے درمیان بھی یہی نسبت ہے، اس لیے کبھی حدیث الگ ہوجاتی ہے وہ سنت نہیں ہوتی، اور کبھی سنت الگ ہوجاتی ہے وہ حدیث نہیں ہوتی، اور کبھی دونوں جمع ہوجاتے ہیں وہ حدیث بھی ہوتی ہے اور سنت بھی''۔ (حدیث اور سنت میں فرق، ص:۱۲)

حدیث وسنت میں نسبت سے متعلق اس طولانی عبارت کو پڑھ کر اگر کوئی عام آدمی جسے فن منطق کی ابجد کی بھی سدھ بدھ نہیں ہے اسے مجذوب کی بڑ سمجھ بیٹھے تو جائے حیرت وشکایت نہیں ہے۔

زیر نظر کتابچہ کے مرتب خوب جانتے ہیں کہ اسلامی علوم وفنون میں علم حدیث وسنت کا تعلق علوم عقلیہ سے نہیں؛ بلکہ علوم نقلیہ سے ہے جس میں نقل حاکم اور عقل خادم ہوا کرتی ہے؛ لہٰذا جب ان کا یہ دعویٰ ہے کہ حدیث وسنت میں عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہے تو اب سیدھی بات یہ تھی کہ وہ اپنے اس دعویٰ کی تصدیق وتائید میں ائمہ حدیث واصول میں سے کسی کا قول نقل کردیتے تو ان کا دعویٰ مدلل ہوجاتا؛ کیونکہ علمائے حدیث اور فقہائے اصول کا یہ فن ہے اور ہر فن میں صاحب فن ہی کی بات کو درجۂ استناد حاصل ہوا کرتا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے یہ کتنے پتے کی بات کہی ہے کہ "العلم اما قول مصدق أو استدلال محقق" مگر انھوں نے یہ نہ کرکے عام وخاص من وجہ کسے کہتے ہیں اپنے قاری کو اسی کے سمجھانے میں فکروقلم کا سارا زور صرف کردیا، اس طرح ان کا یہ دعویٰ سرحد علم میں داخل ہونے سے رہ گیا، بایں صورت اسے اوساط علمیہ میں ایک خودتراشیدہ، خانہ ساز قول سے زیادہ کی حیثیت حاصل نہ ہوسکے گی۔

اگر ہمارے جیسے ایک معمولی طالب کی سنیں تو حدیث وسنت میں اصل وفرع

(فرعية المدلول على الدال)) کی نسبت ہے کیونکہ طریقۂ مسلوکہ فی الدین کی (فی الجملہ) دلیل وحجت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہی ہیں، محدث سندھی اور امام شاطبی کی تصریحات اس بارے میں گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہیں۔

ضروری تنبیہ: کتابچہ ''حدیث وسنت میں فرق'' کے مرتب نے اگرچہ اس کی صراحت نہیں کی ہے کہ حدیث وسنت میں یہ نسبت کس اصطلاحی سنت کے اعتبار سے بیان کی جارہی ہے؛ لیکن اس نسبت کے بیان سے پہلے انھوں نے سنت بمعنی الطريقة المسلوكه کا ذکر کیا ہے اور نسبت کے بیان سے فارغ ہوکر اتباع سنت کا بیان شروع کردیا ہے اور اس بیان میں انھوں نے جن چودہ احادیث وآثار کو نقل کیا ہے ان میں چند کے علاوہ سب الطريقة المسلوكه کے معنی میں ہیں، اس لیے ان کی عبارت کے سیاق وسباق سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بحث کا محور وہی سنت ہے جو الطريقة المسلوكه کے معنی میں ہے، اپنے اسی اندازہ کی بنیاد پر ہم نے حدیث وسنت میں دال ومدلول کی نسبت بیان کی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

(۵) اس کے بعد آں موصوف یہ قطعی فیصلہ سنا رہے ہیں کہ

اٹھانوے فیصد حدیثیں ہیں جو سنتیں بھی ہیں صرف ایک فیصد ایسی حدیثیں ہیں جو سنت نہیں، اور ایک فیصد خلفائے راشدین کی وہ باتیں ہیں جن کو لینا ضروری ہے اور وہ حدیث نہیں صرف سنت ہیں (حدیث وسنت میں فرق، ص:۱۲، موصوف نے تحفۃ القاری، ج:۱،ص:۶۵ سے یہ نقل کیا ہے جس کا حوالہ خود انھوں نے دیا ہے)

آں محترم اگر اس فیصلہ کے سنانے سے پہلے اس کی نزاکت اور دوررسی پر ادنیٰ غور وفکر کرلیتے تو شاید ان کا خامۂ سبک رفتار اس وادئ پرخار میں قدم نہ رکھتا، کون نہیں جانتا کہ اس فیصلہ کی صداقت اور اس کا مبنی برصواب ہونا دو باتوں پر موقوف ہے:

(الف) رسول خدا ﷺ سے مروی تمام احادیث وسنن جو اس عالم بسیط میں موجود ہیں ان سب کو بغیر کسی استثناء کے اپنے دائرۂ حفظ وضبط میں محفوظ کرلیا جائے۔ جبکہ عہد صحابہ سے لے کر آج تک کسی محدث وحافظ حدیث کے بارے میں یہ

دعویٰ نہیں کیا گیا ہے کہ اس کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جملہ احادیث وسنن محفوظ تھیں، حتیٰ کہ امام یحیٰ بن معین جنھوں نے اپنے دست خاص سے دس لاکھ حدیثیں نقل کی تھیں، امام احمد بن حنبل جنھوں نے اپنی مسند کو سات لاکھ سے زاید احادیث سے منتخب کر کے مرتب کیا تھا، امام ابوزرعہ رازی جن کو چھ لاکھ احادیث محفوظ تھیں، امام بخاری جن کی "الجامع الصحیح" چھ لاکھ حدیثوں سے منتخب ہے، امام مسلم جنھوں نے تین لاکھ احادیث سے انتخاب کر کے اپنی "الصحیح" تیار کی تھی، اور امام ابوداؤد خود فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے پاس موجود پانچ لاکھ احادیث سے چھانٹ کر اپنی "السنن" کی تالیف کی ہے۔

ان میں سے بھی کسی کے بارے میں کسی امام حدیث نے یہ نہیں کہا ہے کہ انھیں ساری احادیث پر دسترس حاصل تھی، بلکہ ائمہ حدیث کے یہاں یہ طے شدہ امر ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جملہ حدیثیں کسی فرد واحد کے پاس محفوظ نہیں ہیں، چنانچہ امام عبدالرحمٰن ابن الجوزی متوفی ۵۹۷ھ بیان کرتے ہیں:

حصرالاحادیث یبعد امکانه، غیر ان جماعة بالغوا فی تتبعها وحصرها. (تدریب الراوی، ج:۱، ص:۱۲۵، مطبوعہ قاہرہ بتحقیق عزت علی عطیہ وموسی محمد علی)

ساری احادیث کے احاطہ کا امکان بعید ہے پھر بھی محدثین کی ایک جماعت نے ان کی تلاش وجستجو اور احاطہ کرنے میں بلیغ کوشش کی ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی ابوعبداللہ محمد بن یعقوب الاخرم متوفی ۳۴۴ھ کے قول: "قلما یفوت البخاری ومسلّما ما ثبت من الحدیث" پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والذی یظهر لی من کلامه (اعنی الاخرم) انه غیر مرید الکتابین وانما اراد مدح الرجلین بکثرة الاطلاع والمعرفة، لکن لما کان غیر لائق ان یوصف احد من الامة بانه جمع حدیث جمیعه حفظاً واتقاناً حتی ذکر عن الشافعی انه قال: من قال ان السنة کلها اجتمعت عند رجل واحد فسق، ومن قال ان شیئًا منها فات الامة فسق (توضیح الافکار لمعانی

تنقیح الانظار، ج:١، ص:٥٤-٥٥)

حافظ اخرم کے کلام سے جو میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ ”قلما یفوت البخاری ومسلمًا“ سے ان کی مراد صحیحین نہیں ہے؛ بلکہ انھوں نے اپنے اس قول سے خود بخاری ومسلم کی ان کی احادیث کی کثرت معرفت واطلاع پر تعریف کی ہے؛ لیکن یہ غیر مناسب ہے کہ امت میں سے کسی فرد کو اس بات سے متصف کیا جائے کہ اس نے ساری حدیثوں کو اچھی طرح محفوظ کرلیا ہے حتیٰ کہ امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ جو شخص یہ کہے کہ ساری حدیثیں شخص واحد کے پاس مجتمع ہیں تو یہ کہنے والا فاسق ہوگا اور جو یہ کہے کہ حدیث کا کوئی حصہ امت میں محفوظ ہونے سے رہ گیا تو وہ بھی فاسق ہے۔

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

”من اعتقدان کل حدیث صحیح قد بلغ کلّ واحد من الائمة او امامًا معیناً فهو مخطی خطأ فاحشاً قبیحاً“ (رفع الملام عن ائمة الاعلام، ص١٧) حافظ ابن عبد البر نے بھی استذکار، ج١، ص٣٦ پر یہی بات کہی ہے۔

(ب) پھر ان ساری احادیث کے مجموعہ کی ایک ایک حدیث وسنت میں مکمل امعان وتعمق اور بالغ نظری سے یہ فیصلہ کیا جائے کہ اس قدر صرف احادیث ہیں اور اس قدر صرف سنتیں ہیں اور اتنی مقدار حدیث وسنت دونوں کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے عمر دراز اور فرصت تمام درکار ہے اور جب یہ دونوں امر جن پر اس فیصلہ کی اصابت اور دعویٰ کی صداقت موقوف ہے، اوپر مذکور تفصیل کے مطابق موجود نہیں تو اس دعویٰ کو رجماً بالغیب نہیں تو پھر کیا کہا جائے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب کوئی اپنے مقام سے اوپر اٹھ کر بولنے کی کوشش کرتا ہے تو اس سے اسی قسم کے عجائب وغرائب کا ظہور ہوتا ہے۔

اپنے حدود سے نہ بڑھے کوئی عشق میں
جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

حدیث وسنت کے متعلق مذکورہ فیصد کا قطعی حساب اور بے بنیاد فیصلہ صادر فرمانے کے بعد ارشاد ہو رہا ہے۔

(٦) ''سنت کی اتباع کا حکم ہے، حدیث کا نہیں'' (بلفظہ، ص:۱۲)

اگر آں موصوف یوں لکھتے کہ سنت کی اتباع کا حکم ہے، حدیث کی اتباع کا نہیں تو بات اور واضح ہو جاتی، بہر حال آں موصوف کا یہ عنوان مثبت و منفی دو جزوں پر مشتمل ہے۔

(مثبت) سنت کی اتباع کا حکم ہے۔

(منفی) حدیث کا نہیں یعنی حدیث کی اتباع کا حکم نہیں ہے۔

اس عنوان کے پہلے جزء پر ہم بزبان ودل صدّقنا کہتے ہیں، یقیناً بارگاہ رسالت سے امت کو دینی امور میں طریقۂ نبوی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کی مکمل اتباع کا بتاکید حکم دیا گیا ہے۔

البتہ عنوان کے دوسرے جزء کے بارے میں عرض ہے کہ آں محترم نے اپنے کتابچہ کے صفحہ ۹، ۱۰، ۱۱ پر حدیث پاک کی مع مثال یہ تعریف درج کی ہے بغرض اختصار ہم نے مثالیں چھوڑ دی ہیں۔

(۱) آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا وہ سب حدیثیں ہیں...

(۲) آپ ﷺ نے جو کام کیے وہ حدیثیں ہیں...

(۳) آپ نے جن باتوں کو برقرار رکھا وہ بھی حدیث ہیں...

(۴) نبی ﷺ کے صفات یعنی ذاتی حالات بھی حدیث ہیں (بلفظہ)

آپ کی نقل کردہ اس تعریف کے بموجب آپ ﷺ کے فرمودات اور باتیں، آپ کے کیے ہوئے کام، آپ کی تقریرات اور صفات یہ سب کی سب احادیث ہیں، تو کیا آپ اپنے اس عنوان سے جماعت مسلمین کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اللہ کے نبی کے اقوال، افعال اور تقریرات کی پیروی کا حکم نہیں دیا گیا ہے، یعنی باعتبار مفہوم مخالف اس سے منع کیا گیا ہے (نعوذ باللہ منہ) جبکہ اللہ جلّ شانہ کا فرمان ہے:

"اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُولَ" اے مسلمانو! اللہ کے احکام کی اطاعت کرو اور رسول اللہ کے احکام کی پیروی کرو"، اس کے مقابلہ میں آنجناب فرمارہے ہیں رسول کی باتوں، اور کاموں کی پیروی کا حکم نہیں، آخر کون صاحب عقل وہوش آپ کی اس بے تکی کو مانے گا، ایسا لگتا ہے کہ کتابچہ کی ترتیب وتالیف کے وقت آپ نے فکر وفہم کے دریچے بند کر لیے تھے، ورنہ ایسی بے بنیاد بات آپ کے نوک قلم سے صفحۂ قرطاس پر کیوں ثبت ہوتی۔

جناب من ذرا غور کیجیے اسی سنت کی پیروی میں حدیث رسول ﷺ کی اتباع وپیروی بھی مدغم وشامل ہے جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ سنت باصطلاح ۱؎ یعنی علمائے اصول کے عرف کے مطابق حدیث کے مرادف ومساوی ہے دونوں کی حقیقت ایک ہے صرف نام کا فرق ہے اس کی مکمل تفصیل گذشتہ صفحات میں گزرچکی ہے، لہٰذا سنت کی اتباع کا حکم عین حدیث کی اتباع کا حکم ہے۔

اور سنت باصطلاح ۲؎ و ۳؎ علی الترتیب یعنی فقہی سنت جو درجے میں واجب کے بعد اور نفل ومستحب سے مقدم ہے، اور سنت بمعنی الطریقة المسلوکة فی الدین یہ دونوں سنتیں فی الجملہ حدیث رسول کی مدلول اور حدیث ان کی دلیل وحجت ہے، یعنی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر (یعنی حدیث) ہی سے ان سنتوں کا سنتِ عبادت اور الطریقة المسلوکه ہونا ہمیں معلوم ہوا ہے، تو مدلول کی تو پیروی کا حکم ہو اور اس مدلول کا مدلول ہونا جس دلیل وحجت سے ثابت ہو اس کی اتباع وپیروی کا حکم نہ ہو ایسا کیوں کر ہوسکتا ہے، اسی لیے علماء کہتے ہیں کہ حدیث کے مقتضی پر عمل ہی حدیث پر عمل ہے، ملاحظہ کیجیے امام سندھی کی عبارت کے الفاظ:

"واتباع السنة بهذا المعنى (أى بمعنى احد الادلة) الاخذ بمقتضاها فى تمام الاحكام الدينية من الاباحة والوجوب والحرمة والندب والكراهة" (شرح سنن ابن ماجہ، ج:۱، ص:۳) اور سنت کی اتباع اس معنی میں (جبکہ وہ احکام فقہ کے دلائل اربعہ میں سے ایک دلیل کے معنی میں ہو) دین کے تمام احکام

اباحت، وجوب، حرمت، استحباب کراہت (وغیرہ) میں سنت (وحدیث) کے طلب وتقاضا کے مطابق عمل کرنا ہے، (امام سندھی کی مکمل عبارت سنت باصطلاح ۳ کی تحقیق میں گزر چکی ہے اسے ملاحظہ کرلیا جائے)

علمائے فن کی اس صراحت کے باوجود یہ کہنا کہ حدیث کی اتباع کا حکم نہیں ہے، انتہائی حیرت انگیز اور افسوسناک ہے، اس موقع پر ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ''ادا سناش نئ دلبر باخطا ایں جاست''

آں جناب نے اپنی اس بے بنیاد خلاف علم وعقل بات کی تائید میں ایک عالم کی طرف سے جس چیلنج کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ

ایک چیلنج دیتا ہوں اور قیامت کی صبح تک دیتا ہوں کہ کوئی ایسی حدیث لاؤ چاہے ضعیف ہی کیوں نہ ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کو مضبوط پکڑنے کا حکم دیا۔ (بلفظہ، ص:۱۲-۱۳)

اس بیجا چیلنج پر اوپر مذکور تفصیل کی روشنی میں غور کرلیا جائے، کیا اس کی حقیقت الفاظ پرستی (بمعنی پسندی) اور عرف عام میں کٹھ حجتی سے فزوں تر ہے۔

کہہ رہا ہوں جنون میں کیا کیا
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اہل سنت والجماعت کے نزدیک سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت قرآن مجید میں منصوص ہونے کی بناء پر قطعیت الثبوت ہے اس لیے اس کا منکر خارجِ اسلام باور کیا جاتا ہے۔ اب فرض کیجیے ان کی صحابیت کا منکر کہے کہ ایک چیلنج دیتا ہوں اور قیامت کی صبح تک دیتا ہوں کہ قرآن کی کوئی ایسی آیت لاؤ کہ اللہ نے ابوبکر صدیق کو صحابی کہا ہے، تو کیا اس کا یہ چیلنج علمی اعتبار سے قابل سماعت ہوگا؟

آنجناب نے اپنے اسی دعویٰ کی تائید میں پاکستان کے مشہور مناظر عالم مولانا محمد امین صفدر اوکاڑوی رحمہ اللہ کی درج ذیل عبارت بھی نقل کی ہے، مولانا مرحوم لکھتے ہیں:

یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بابرکت کام بھی دو حصوں میں تقسیم ہیں کچھ کام آپ عادۃً فرماتے تھے اور کچھ کام ضرورۃً فرماتے تھے، اب ان دونوں میں سے ہم نے تابعداری کن کاموں کی کرنی ہے؟ فرمایا ''علیکم بسنتی'' وہ جو میں عادۃً کام کرتا ہوں ان کی تابعداری کرو، اب حدیث میں دونوں چیزیں آئیں گی، سنت والے کام بھی اور عادت والے کام بھی۔ اب جس میں دو چیزیں آجائیں ہمیں حکم ہے ''علیکم بسنتی'' آپ کی عادت کا اتباع کرنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک عادت ہم نے بھی عادت بنانا ہے اور اپنانا ہے۔ (حدیث وسنت میں فرق، ص:۱۳)

مولانا اوکاڑوی مرحوم نے ایسے جہان میں گھر بنالیا ہے کہ ان سے رابطہ ممکن نہیں اگر وہ ہماری دنیا میں ہوتے تو ہم اس عبارت سے متعلق معروضات ان کے سامنے پیش کرتے اور ان کی اس عبارت کی وضاحت ان سے ضرور چاہتے، مگر اب اس کا موقع کہاں ہے، لہٰذا اس عبارت پر نقد وتبصرہ کے بجائے حجۃ الاسلام امام ابوحامد غزالی متوفی ۵۰۵ھ کی قابل قدر تصنیف ''الاربعین فی اصول الدین'' سے ایک اقتباس نقل کررہے ہیں، دونوں عبارتوں اور ان کے مفہوم میں موازنہ کر کے فیصلہ کرلیا جائے۔

امام غزالی رحمہ اللہ قمطراز ہیں:

اعلم: ان مفتاح السعادة: فی اتباع السنة، والاقتداء برسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی جمیع مصادره وموارده، حرکاته وسکناته؛ حتی فی هیئة اکله وقیامه، ونومه وکلامه: لست اقول ذلك فی آدابه فی العبادة فقط. لانه لاوجه لاهمال السنن الواردة فی غیرها؛ بل ذلك فی جمیع امور العادات فیه یحصل الاتباع المطلق کما قال تعالیٰ: (قل: اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِی یُحْبِبْکُمُ اللّٰه، وَیَغْفِر لَکُمْ ذُنُوبَکم) وقال تعالیٰ: (وَمَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاکُم عنه فَانْتَهُوا) فعلیك ان تتسرول قاعدًا وتتعَمّم قاعدًا، وتاکل بیمینك، وتقلم اظفارك... وکذا فی جمیع

حركاتك وسكناتك... فهل بعد ذلك. بعاقل ان يتساهل فى امتثال السنة فيقول هذا من قبيل العادات! فلا معنى للاتباع فيه. فان ذلك يغلق عنه بابًا عظيماً من ابواب السعادات" (بحواله حجة الحديث للاستاذ عبدالغنى، ص: ۸۰-۸۱)

جان لو! سعادت کی کنجی اتباع سنت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ مصادر وموارد (اخذ کردہ امور اور طریقے) حرکت وسکون، حتیٰ کہ قیام وطعام اور سونے وگفتگو کی ہیئت وصورت کی اقتداء وپیروی میں ہے، میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ یہ اتباع فقط آپ کے آداب عبادت میں ملحوظ ہوگی؛ کیونکہ آپ کی وہ سنتیں جو غیر عبادت میں وارد ہوئی ہیں ان کی جانب سے بے توجہی کی کوئی وجہ نہیں ہے، بلکہ عادتوں کے جملہ امور میں یہ پیروی ہوگی، اسی مکمل اقتداء سے اتباع مطلق کا حصول ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (قل ان کنتم الخ) آپ کہہ دیجیے اگر تم لوگ اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں محبوب بنالیں گے؛ اور جیسے اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: وَمَا اتاكم الرسول الخ اللہ کے رسول تمہیں جو (حکم) دیں تو اسے بجالاؤ، اور تمہیں جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ، لہٰذا پائجامہ بیٹھ کر پہننے، عمامہ کھڑے ہوکر باندھنے، اور ناخون تراشنے کو لازم پکڑو، کیا کسی عاقل کے لیے مناسب ہے کہ وہ سنت کی بجاآوری میں تساہل اور سستی برتے اور یہ کہے کہ یہ تو ازقبیل عادت ہے، لہٰذا اس کی اتباع کا کوئی معنی نہیں، اس کی اس روش سے سعادتوں کے ابواب میں سے عظیم باب اس سے بند ہوجائے گا۔

اسی کے ساتھ حافظ ابن عبدالبر متوفی ۴۶۵ھ کا یہ بیان بھی ملاحظہ کیجیے:

ان فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم كله بحسن التأسّى به فيه على كل حال، الا ان يخبر رسول الله صلى الله عليه وسلم انه له خاصة، او ينطق القرآن بذلك، والا فالاقتداء به اقل احواله ان يكون مندوباً اليه فى جميع افعاله، والدليل على ان افعاله كلها بحسن التأسّى به فيها قول

الله عز وجلّ "لقد كان فى رسول الله اسوة حسنة" فهذا على الاطلاق، الا ان يقوم الدليل على خصوص شئى فيجب التسليم له... وقال تعالىٰ: "انك لتهدى إلى صراط مستقيم صراط الله، وقال صلى الله عليه وسلم: خدوا عنّى مناسككم، وقال: صلوا كما رأيتمونى اصلى، وقال عبدالله بن عمر: ان الله بعث الينا محمدًا صلى الله عليه وسلم ونحن لا نعلم شيئًا فانما نفعل كما رأيناه يفعل" (التمهيد، ج:۵، ص:١١٦،١١٧،١١٨)

بلا شبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے افعال میں آپ ﷺ کی اقتدار بہر حال مستحسن ہے، الا یہ کہ آپ ﷺ بتائیں کہ یہ فعل ان سے مختص ہے، یا قرآن حکیم اس خصوصیت پر ناطق ہو، ورنہ آپ کی اقتدار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جمیع اعمال میں کم از کم مندوب الیہ ہے یعنی اس اقتدار کی دعوت دی گئی ہے، اس کی دلیل اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" تمہارے لیے اللہ کے رسول (ﷺ) (کے طریقہ) میں بہترین نمونہ ہے، اور یہ فرمان مطلق ہے، (لہٰذا امت کے حق میں بہر حال یہ پیروی مستحسن وبہتر ہوگی) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّكَ لَتَهْدِي إِلىٰ صِراطٍ مُسْتَقِيمٍ صَرَاطِ اللّٰه" بیشک آپ ﷺ صراط مستقیم یعنی راہ خداوندی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، (گویا یہ خود خدائے عالم الغیب والشہادۃ کی طرف سے شہادت ہے کہ آپ ﷺ کا ہر قول وعمل ہدایت ہی ہدایت ہے جس کی آنکھ بند کر کے پیروی کی جائے گی) نیز اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "خُذوا عنى مناسككم" مجھ سے اپنی عبادتوں بالخصوص حج کے طریقے سیکھ لو اور آپ نے یہ بھی فرمایا "صلّوا كما رأيتمونى اصلى" تم لوگ نماز پڑھو جس طرح تم مجھے پڑھتا دیکھتے ہو، (ان دونوں مقدس حدیثوں سے معلوم ہوا کہ آپ کا عمل سراپا دین ہے، جس سے دین سیکھا جائے گا) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا اور حال یہ تھا کہ ہم کچھ نہیں جانتے تھے، تو ہم جس طرح آپ کو کرتا دیکھتے ٹھیک اسی طرح کرتے تھے۔

قرآن وحدیث کے یہ نصوص بتارہے ہیں کہ علی الاطلاق آپ کے افعال ہمارے لیے نمونہ، ہدایت، دین اور طریقہ دین ہیں۔ یہ دو ایسے علمائے قدیم کی شہادت ہے جو علم وفضل اور امانت ودیانت میں اس مقام پر تھے کہ اگر سارے علمائے عصر کے علوم وکمالات کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں ان کے علم وفضل کو، تو یقین مانئے کہ انھیں کا پلڑا بھاری ہوگا۔ تو کیا اس کے باوجود بھی یہ حق کسی کو پہنچتا ہے کہ کہے آپ کا یہ قول وفعل صرف حدیث ہے لہٰذا یہ دین میں حجت نہیں، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام بربنائے ضرورت یا مصلحت کیے تھے، اس لیے یہ امت کے لیے دلیل عمل نہیں ہیں۔

بلاشبہ یقینی طور پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لیے مطاع مطلق ہیں اس لیے آپ کے اعمال میں اخذ ورد کی یہ خانہ ساز تقسیم فکر ونظر کی زَلت یا مرتبہ نبوت ومقام رسالت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اور بقول امام غزالی اپنے اوپر خود اپنے ہاتھوں باب سعادت بند کرنے کی سعی نامحمود ہے۔ (اعاذنا اللہ منہ)

(۷) آں موصوف نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے یہ عنوان قائم کیا ہے۔ (ص ۱۳): ''سنت کی اتباع کا حکم'' اور اس کے ذیل میں چودہ احادیث وآثار پیش کیے ہیں، گویا اوپر مذکور عنوان اور اس کے تحت مندرج دعویٰ اور چیلنج کے اثبات میں یہ باب قائم کیا ہے، اس سلسلے میں آں موصوف ہی کے طرز استدلال اور انداز بیان کے مطابق یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب آپ اور صاحبِ چیلنج کے نزدیک احادیث کی حجیت اور اس کی اتباع کا حکم ثابت ہی نہیں ہے تو ان احادیث سے سنت کی اتباع کے حکم پر استدلال واثبات کا کیا مطلب ہے؟ آپ کا یہ استدلال آپ کے اس نظریہ کے مطابق کیسے درست ہوگا؟ مگر اس طرح کی مناظرانہ بحث کے بجائے عرض ہے کہ آپ کی ان پیش کردہ احادیث میں لفظ سنت اگر اصطلاح ۱؎ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر کے معنی میں ہے (چنانچہ علماء اصول اسی معنی پر متفق ہیں) اس وقت اس کا حدیث کے مرادف وہم معنی ہونا ظاہر ہے۔ جیسا کہ آگے اس کی تفصیل گزر چکی

ہے،اوراس سنت وحدیث کا حجت ہونااوراس کے مدلول ومقتضی کی اتباع وپیروی متفق علیہ ہے،اہل سنت والجماعت کااس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اوراگر باصطلاح ۳؎ "الطریقة المسلوکه فی الدین" دینی راستہ،یعنی وہ راستہ جس پر مسلمانوں کو چلنا ہے (بلفظہٖ) کے معنی میں ہے، جیسا کہ آنجناب نے بیان کیا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں لفظ سنت سے کوئی خاص متعین سنت وطریقہ نہیں ؛ بلکہ پوری شریعت اور مکمل اسلامی طریقہ مراد ہے،خودآپ کی بیان کردہ سنت کی تعریف سے ''یعنی وہ راستہ جس پر مسلمانوں کو چلنا ہے'' بھی یہی مطلب واضح ہورہا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ شریعت اور اسلامی طریقہ قرآن وحدیث ہی سے ماخوذ ہوگا، کیونکہ کوئی طریقہ اور راستہ ازخود وجود میں نہیں آتا، اس لیے دین اسلام میں فی الجملہ حدیث کی حجیت کے اعتراف اور اس کی اتباع کے بغیر چارہ نہیں۔

''پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا''

(۸) پھر ''عنوان چند مثالیں: ''حدیث ہیں مگر سنت نہیں'' (ص ۱۷) کے تحت نواحادیث درج کی ہیں ان احادیث کواس عنوان کے تحت ذکر کرکے گویا وہ اپنے پڑھنے والوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ کتب احادیث میں ان حدیثوں کو دیکھ کرانھیں حجت اورلائق اتباع نہ سمجھیں؛ کیونکہ یہ صرف ''حدیث'' ہیں سنت نہیں ہیں اورحکم سنت کی اتباع کا ہےحدیث کی اتباع کانہیں ہے،اس موقع پرآں موصوف کی رسالہ میں پیش کردہ احادیث پر بحث ونظر سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں کہ کن احادیث سے دینی احکام میں احتجاج واستدلال کیا جاسکتا ہےاور کن سے نہیں، ائمہ حدیث وفقہ کا متفقہ فیصلہ کیا ہے اسے نقل کردیا جائے،تاکہ اس کی روشنی میں زیرغور مسئلہ پربصیرت کےساتھ نظرڈالی جاسکے۔

احادیث سے احتجاج کا حکم

(الف) حدیث (من حیث الحدیث) کی حجیت قرآن وحدیث اوراجماع سے

ثابت ہے؛ بلکہ حجیت حدیث ضروریات دینیہ میں سے ہے، ابن ہمام نے اصول فقہ پر اپنی کتاب التحریر میں اس کی صراحت کی ہے جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

(ب) وہ حضرات صحابہ جنھوں نے براہ راست آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث اخذ کی ہے، ان کے حق میں یہ حدیث حجت قطعی ہوگی۔

(ج) بعد از صحابہ جن کو کوئی حدیث نقل متواتر کے ذریعہ پہنچی ہے، ان کے حق میں بھی یہ حدیث حجت قطعی ہوگی۔

(د) اگر حدیث کا حصول ایسے واسطوں سے ہوا ہے جو تواتر کی حد سے قاصر ہیں، جنھیں اصطلاح شرعی میں خبر آحاد کہا جاتا ہے، تو دو شرطوں کے ساتھ خبر آحاد کی حجیت پر بھی اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے۔

- وہ حدیث مقبول یعنی صحیح یا حسن ہو
- معمول بہ ہو

توضیح: ان دو مذکورہ شرطوں کے علاوہ حدیث کے حجت ہونے کے لیے کسی مزید شرط کا اعتبار نہیں ہے۔ حدیث کے معمول بہ ہونے کے لیے بس یہ کافی ہے کہ اس کے ترک پر اتفاق واجماع نہ ہو؛ بلکہ صحابہ اور ان کے بعد ائمہ مجتہدین وغیرہ میں سے بعض حضرات ہی نے کسی حدیث کے مدلول ومقتضی پر بدرجۂ اباحت بھی عمل کر لیا تو وہ معمول بہ ہو جائے گی سب کا یا اکثر کا اس پر عمل ضروری نہیں ہے۔

چنانچہ حافظ ابن رجب متوفی ۷۹۵ھ لکھتے ہیں:

"اما الائمة، وفقهاء اهل الحديث فانهم يتبعون الحديث الصحيح حيث كان، إذا كان معمولا به عند الصحابة ومن بعدهم، أو عند طائفة منهم، فاما ما اتفق السلف على تركه فلا يجوز العمل به لأنهم ما تركوه الاعلى علم انه لا يعمل به" (فضل علم السلف على الخلف، ص ۱۰)

بہر حال ائمہ اور فقہائے اصول حدیث تو یہ حضرات حدیث صحیح کی اتباع کرتے ہیں وہ جہاں بھی ہو بشرطیکہ وہ صحابہ یا ان کے بعد والوں کے نزدیک یا ان میں سے

ایک طائفہ ہی کے نزدیک معمول بہ رہی ہو، اور جس حدیث کے ترک پر سلف متفق ہوں تو اس پر عمل جائز نہیں اس لیے کہ ان بزرگوں نے اس کو یہ جان کر ہی ترک کیا ہے کہ اس کے مطابق عمل نہیں کیا جائے گا (یعنی یہ منسوخ ہے یا بے اصل ہے)

اسی طرح امام ترمذی متوفی ۲۷۹ھ یا ۲۷۵ھ علی اختلاف الاقوال اپنی ''السنن'' کی احادیث کے بارے میں صراحت کرتے ہیں:

جمیع ما فی هذا الكتاب من الحديث هو معمول به وبه اخذ بعض اهل العلم ماخلا حديثين؛ حديث ابن عباس: ان النبی صلى اللّٰه عليه وسلم جمع بين الظهر والعصر بالمدينة والمغرب والعشاء من غير خوف ولا سفر ولا مطر. وحديث النبی صلى اللّٰه عليه وسلم انه قال: اذا شرب الخمر فاجلدوه فان عاد فی الرابعة فاقتلوه. (تحفة الاحوذی، ج ۱۰، ص ۳۵۶)

وہ ساری حدیثیں جو اس کتاب میں ہیں وہ معمول بہ ہیں اسے بعض اہل علم نے لیا ہے، سوائے دو حدیثوں کے: (۱) حدیث ابن عباس ان النبی صلى اللّٰه عليه وسلم جمع، الحديث. (۲) وحديث النبی صلى الله عليه وسلم انه قال اذا شرب الخمر، الحديث.

تقریباً یہی بات امام ذہبی نے سیر اعلام النبلاء، ج ۱۸، ص ۱۹۱ میں ابن حزم کے قول: انا اتبع الحق واجتهد ولا اقيّد بمذهب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

من بلغ الاجتهاد المقيّد وتأهل للنظر دلائل الائمة، فمتى وضح له الحق فی مسألة، وثبت فيها النص وعمل بها احد الائمة الاعلام كابی حنيفة مثلاً، او كمالك، او الثوری، او الاوزاعی، او الشافعی، وابی عبيد، واحمد، وإسحاق فليتبع فيها الحق الخ.

جو شخص اجتہاد مقید کے درجہ پر پہنچ گیا اور ائمہ کے دلائل میں غور فکر کا اہل ہو گیا ہے تو اس کے لیے جب کسی مسئلہ میں حق واضح ہو جائے اور اس میں نص ثابت

ہو جائے اور اس نص پر ائمہ اعلام میں سے کسی نے عمل کیا ہے، مثلاً ابوحنیفہ، اور جیسے مالک، یا ثوری، اوزاعی، یا شافعی اور ابوعبید، واحمد واسحاق تو پھر اس مسئلہ میں حق کی اتباع کرے۔

یہ تفصیل بتا رہی ہے کہ صرف وہی حدیث حجت نہیں ہوگی جس کے ترک پر صحابہ، یا ائمہ مجتہدین کا اتفاق ہے بقیہ ساری احادیث حجت اور لائق اتباع ہیں، پھر بالخصوص احادیث رخص میں حجت ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس پر عمل بھی ضروری ہے؛ بلکہ جس باب سے یہ حدیث متعلق ہے اس میں اس حدیث کی حجیت کا اعتقاد کافی ہے، صاحب ''دراسات اللبیب'' لکھتے ہیں: ''ان معنی اخذ باحادیث الرخص رویتها کذلك مباحة، وإن لم یقع العمل بها منهم قطّ، کما لا یخفیٰ علی الفطن'' (تحفۃ الاحوذی، ج۱۰،ص۳۵۷)

رخصتوں کی احادیث میں اخذ یعنی اس کے معمول بہ ہونے کا معنی یہ ہے کہ حدیث کی دلالت کے مطابق اسے مباح مانا جائے، چاہے ان آخذین کا اس رخصت پر عمل کبھی نہ واقع ہوا ہو، جیسا کہ اہل فطانت سے یہ امر پوشیدہ ومخفی نہیں ہے۔

مثلاً آنجناب نے یہ حدیث پیش کی ہے کہ ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضوء کے بعد زوجہ محترمہ کا بوسہ لیا'' (ترمذی باب ترک الوضوء من القبلۃ) اس حدیث پاک کو ائمہ مجتہدین بدرجۂ اباحت حجت مانتے ہیں، تو یہ ہوسکتا ہے انھیں تا مدت العمر اس عمل کا اتفاق نہ پیش آیا ہو پھر بھی وہ اس حدیث کے حجت ماننے والے ہی ہوں گے، بس علماً واعتقاداً اس حدیث کی حجیت کی بناء پر اس کے مدلول یعنی اسی حالت میں بوسہ کو مباح باور کرنا ان کے اس حدیث کے اخذ ومعمول بہ ماننے کے لیے کافی ہوگا، ''فافہم''

ذرا غور فرمایئے اللہ رب العزت نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ''مطاع مطلق'' قرار دیا ہے، تو کیا اللہ جل شانہ اور ان کے رسول کے علاوہ کسی فرد بشر کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ حدیث رسول کو صحیح وغیر منسوخ جانتے ہوئے اس کی حجیت یا اس کے

اتباع سے لوگوں کو منع کرے؟ ''ہرگز نہیں''۔

لہٰذا اللہ کے نبی ﷺ کے مطاع مطلق ہونے کا یہ تقاضا ہے کہ ان کے عمل کو خواہ بدرجۂ اباحت ہی سہی — کہ اباحت بھی اہل سنت والجماعت کے یہاں حکم شرعی ہے —علماً واعتقاداً حجت وقابل اتباع تسلیم کیا جائے، چاہے اس عمل مباح پر عمل کی نوبت نہ آئے، اور اگر یہ عمل کبھی بہ قصد وارادہ ہوجائے تو عمل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں اسے جائز ومباح ہی باور کرے، یہی ائمہ مجتہدین وفقہائے محدثین کا موقف ہے، اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کا بھی یہی موقف تھا، صحیح مسلم میں روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ حدیث بیان کی کہ میں نے رسول خدا ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا کہ ''لا تمنعوا نساء كم المساجد إذا استأذنكم اليها'' اس پر ان کے بیٹے ''بلال'' نے کہا ''لنمنعهنّ'' راویٔ حدیث سالم بن عبداللہ کا بیان ہے کہ بلال کی یہ بات سن کر عبداللہ ان کی طرف (غصہ) سے متوجہ ہوئے اور ان کو اس قدر سخت وسست اور برا بھلا کہا کہ بلال کو اتنا برا بھلا کہتے ہوئے انھیں میں نے کبھی نہیں سنا تھا، اور فرمایا کہ میں تم سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کررہا ہوں اور تو اس کے مقابلہ میں کہتا ہے کہ ہم انھیں ضرور منع کریں گے'' مسند امام احمد میں بروایت مجاہد اس روایت میں یہ زیادتی ہے، قال (اى مجاهد): ''فما كلّمه ابن عمر حتى مات'' پھر بلال سے عبداللہ بن عمر نے تاحیات بات نہیں کی۔ (مشکوٰۃ، ص ۹۷)

سوچا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ خیر اور ہدایت خیز میں عورتوں کے لیے مساجد کی حاضری صرف جائز ہی تھی اس عہد مبارک میں بھی اپنے گھروں میں ہی نماز پڑھنا ان کے لیے افضل تھا، اسی امر جائز کی بلال نے اتباع سے انکار کیا تھا تو باپ نے عمر بھر ان سے بولنا تک گوارا نہیں کیا۔

اسی طرح بیہقی کی سنن الکبریٰ، ج ۱، ص ۳۱۳ میں بہ سند حسن ایک روایت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کو پتہ چلا کہ ان کی بہن کے

صاحبزادے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اپنی بیوی کے ایام حیض میں اس سے الگ دوسرے بستر پر سوتے ہیں تو انھیں بلا کر ڈانٹ پلائی اور فرمایا: "اترغب عن سنة رسول الله صلى الله عليهو سلم" کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ سے اعراض اور بے رخی برتتا ہے۔

بحالت حیض بیوی کے ساتھ ایک بستر پر سونا مباح ہی ہے پھر بھی حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے یہ برداشت نہیں کیا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل مباح کو ترک کیا جائے اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو اس پر سرزنش فرمائی؛ جبکہ مرتب رسالہ انھیں جیسی احادیث مبارکہ کے بارے میں لکھتے ہیں یہ تو صرف حدیث ہیں سنت نہیں؛ لہٰذا لائق اتباع و پیروی نہیں۔

''ببیں تفاوتِ رہ، از کجاست تا بکجا''

سنت باصطلاح ۳ کی تحقیق وتنقیح میں یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ الطريقة المسلوكة فى الدين، اور سنت وشریعت یہ سب الفاظ ایک ہی مفہوم پر دلالت کرتے ہیں، ان سب الفاظ کا معنی ومصداق ایک ہی ہے اور دین کے طریق مسلوک اور شریعت اسلامی میں جس طرح فرض، واجب، مستحب، حلال، حرام، مکروہ وغیرہ احکام ہیں۔ اسی طرح اباحت بھی ایک شرعی حکم ہے، طریقہ مسلوک اور شریعت میں شامل بہت سارے احکام کی مانند اباحت بھی اس کا ایک حصہ اور جزء ہے، اب شریعت کا یہ جزء وحصہ جن احادیث سے ثابت ہوتا ہے انھیں غیر حجت ٹھہرا دیا جائے اور کہا جائے کہ ان کے مدلول ومقتضی کی اتباع کا حکم نہیں ہے تو طریقہ مسلوکہ اور اللہ کی مقرر کردہ شریعت کے اس حصہ کو کہاں سے ثابت کیا جائے گا اور اس صورت میں مکمل شریعت پر عمل کیسے ہوسکے گا؟ اس لیے ''حدیث کی اتباع کا حکم نہیں، حدیث حجت نہیں'' کی رٹ لگانے والوں کو اس پر سو بار سوچنا چاہیے پھر اتنے ہی پر بس نہیں کیا گیا؛ بلکہ دعویٰ کرنے والے یہاں تک دعویٰ کر بیٹھے کہ اہل سنت والجماعت کہتے ہیں قرآن کے بعد حدیث حجت نہیں سنت حجت ہے۔ شاید اپنی ذاتِ واحد ہی کو امت

اہل سنت والجماعت سمجھ لیا گیا ہے ورنہ بصورت دیگر اہل سنت والجماعت پر نرا اتہام وافترا ہوگا۔" اعاذنا اللہ منہ"

یہ احادیث اباحت ورخصت۔جنھیں مرتب رسالہ اسلامی معاشرہ سے در بدر کرنے کے درپئے ہیں۔درحقیقت طریق مسلوک اور جادہ اسلام کے مسافر کے لیے نبی رحمت اور معلم کتاب وحکمت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارگاہ مقدس سے حاصل کچھ سہولتیں اور رخصتیں ہیں، کہ اگر وہ چاہے تو دوران سفر ان سے مستفید ہوسکتا ہے، لہٰذا ہماری سعادت مندی اسی میں ہے کہ حکمت مجسم، ورحمت سراپا صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کردہ ان سہولتوں کو شکر گزاری کے جذبات کے ساتھ صمیم قلب سے قبول کرلیں، جس طرح صحابۂ کرام اور ان کے بعد ائمہ اعلام ومحدثین عظام نے انھیں قبول کیا ہے۔

یا رب صلّ و سلم و دائمًا ابدا – علی حبیبك خیر الخلق کلهم

اس کے حریم قدس کے گرد، گرد وغبار اڑانا اور اس کے متعلق کسی قسم کا شور وغوغا مچانا، کسی باوفا امتی کی شان سے بعید بلکہ بعید تر ہے اور بقول امام غزالی اپنے اوپر سعادت کے دروازوں میں عظیم دروازہ کو بند کرنا ہے (اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائیں)

(۹) اب آخر میں عرض ہے کہ آنجناب نے اس عنوان کے تحت شروع میں بحوالۂ سنن ترمذی جو تین حدیثیں نقل کی ہیں یہ خود امام ترمذی کے نزدیک حجت اور لائق اتباع ہیں، انھوں نے اوپر مذکور اپنے اس قول میں (ان کے اس قول پر ایک بار پھر نظر ڈال لیجیے) صراحت کی ہے کہ میری کتاب میں دو حدیثوں کے علاوہ سب کی سب معمول بہا ہیں، آپ کی نقل کردہ یہ تینوں احادیث، ان مستثنیٰ دو حدیثوں میں سے نہیں ہیں۔

ایک طرف یکے از مصنّفین اصول ستہ، امام حدیث ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن ثورہ ترمذی ہیں جن کی صدائے بلند چہار دانگ عالم میں گونج رہی ہے کہ ان کی "السنن" میں شامل یہ تینوں حدیثیں حجت اور حکم شرع میں ماخذ کے طور پر مستعمل ہیں، اسی کے

ساتھ ''صاحب البیت ادریٰ بما فیہ'' بھی پیش نظر رہے اوران کے مقابلہ میں آنجناب کہہ رہے ہیں کہ یہ صرف حدیث ہیں اور لائق استناد واتباع نہیں ہیں، اب فیصلہ آپ ہی فرمائیں کہ طبقۂ علم ودانش میں امام ترمذی کے بالمقابل آنجناب کی یہ بے سند بات کس شمار میں ہوگی؟ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

ان تین روایتوں کے بعد آنجناب نے مسلسل چھ احادیث بحوالہ صحیح بخاری اور ان کی تشریحات اردو شرح ''تحفۃ القاری'' کے حوالے سے نقل کی ہیں، اس سلسلے میں عرض ہے کہ موضوع زیر بحث میں صاحب تحفۃ القاری خود شدید اضطراب وتضاد کا شکار ہیں انھوں نے پہلے دو مقدموں پر مشتمل ایک ضابطہ وضع کیا کہ ❁ ''حدیث وسنت میں فرق ہے'' ❁ ''حجت سنت ہے حدیث نہیں'' کیونکہ ان کے نزدیک ''حدیث کے حجت ہونے کی کوئی دلیل نہیں'' (بلفظہ، علمی مقالات، ص۱۰۲) اور جب اس ضابطہ کو جزئیات پر منطبق کرنے اور ان کے مصداق متعین کرنے کا مرحلہ آیا تو انتشار ذہنی میں مبتلا ہوگئے، کیونکہ سنت بمعنی ''الطریقة المسلوکه'' کو وہ حجت بتارہے ہیں، جبکہ یہ پورا دین اور مکمل شریعت ہے، اور شریعت ودین تو قرآن وحدیث کے دلائل سے ماخوذ مجموعۂ احکام کا نام ہے تو چیز خود دلائل کی مدلول ہو وہ کسی دینی مسئلہ کی دلیل کیوں کر بن سکتی ہے، یہ ذہن کا انتشار نہیں تو پھر اسے کیا کہا جائے گا؟ کسی حدیث یعنی رسول اللہ کے عمل کو یہ کہہ کر یہ حدیث ہے سنت نہیں کہ اسے حجت مانا جائے اور اس پر عمل کیا جائے (ہم پہلے تفصیل سے یہ بات بحوالہ امام سندھی واضح کر چکے ہیں کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اس حدیث پر عمل کیا جائے گا یا اس کی اتباع کی جائے گی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حدیث کے مدلول ومقتضی پر عمل کیا جائے گا) پھر اسی حدیث اور عمل رسول کے بارے میں کہتے ہیں یہ بیانِ جواز کے لیے تھا یعنی مسئلہ کی وضاحت کے لیے تھا۔ (بلفظہ)

سوال یہ ہے کہ آپ ﷺ کی یہ حدیث یعنی عمل جب حجت نہیں ہے تو اس سے بیان جواز اور مسئلہ کی وضاحت کیسے ہوگی، جواز واباحت بھی دیگر احکام شرع کی طرح

ایک حکم شرعی ہے، لہٰذا اس کا ثبوت بھی اوراحکام شرع کی طرح کسی دلیل شرعی ہی سے ہوگا تو پھر حجت کی صفت سے عاری اس حدیث سے یہ بیان جواز کیسے ثابت ہوگیا، یہ اضطراب وانتشار نہیں تو پھر کیا ہے؟ ''الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں''

اس صورتِ حال میں تحفۃ القاری کا حوالہ آپ کے حق میں کتنا مفید ہوگا اسے آپ سمجھیں، کسی حدیث کے محتج بہ ہونے کے لیے فقہاء ومحدثین کا متفقہ ضابطہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے اس ضابطہ پر منطبق کرکے دیکھ لیں اور مزید اطمینان کے لیے ان حدیثوں سے متعلق تشریحات وتفصیلات کے لیے فتح الباری، یا عمدۃ القاری وغیرہ ماہرفن کی کتابوں کا مطالعہ کریں ان میں کوئی حدیث ایسی نہیں ملے گی جسے حجت نہ مانا گیا ہو، چونکہ ہم ان حدیثوں میں سے اکثر پر اپنے رسالہ ''حجیت حدیث اور حدیث پر عمل کی صورتیں'' میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں، اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان جملہ تفصیلات کا یہاں بھی اعادہ کیا جائے اس لیے اس اجمالی اشارہ پر اکتفار کیا جارہا ہے، یہ اشارہ بھی ان شاء اللہ کافی ہوگا۔ "العاقل تکفیه الاشارہ"

(۱۰) پھر صفحہ ۲۵ پر عنوان قائم کیا ہے:

''تین قسم کی روایتیں حدیث ہیں سنت نہیں''۔ پہلی قسم: منسوخ اور اس کی تین مثالیں:

پہلی مثال: جو حدیثیں منسوخ ہوگئیں، وہ سنت نہیں، جیسے "ما مست النار" سے وضو کا حکم حدیث میں ہے مگر وہ منسوخ ہے۔

اس حدیث کو مطلقاً منسوخ کی مثال میں پیش کیا جانا محل نظر ہے؛ کیونکہ نسخ منصوص میں ناسخ ومنسوخ واضح اور متعین ہوتے ہیں اس لیے اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں، جبکہ اس مسئلہ میں حضرات صحابہ رضوان اللہ اجمعین کا اختلاف ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کان آخر الامرین من رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ترك الوضوء مِمّا غیرت النار'' (سنن ابی داؤد مع بذل المجہود، ج۱، ص۱۱۶)

مما غیرت النار سے وضوء اور ترک وضوء ان دونوں میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ترک وضوء کا تھا۔ (اسی پر جمہور صحابہ کا عمل تھا) جبکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”کان آخر الامرین من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الوضوء مما مست النار“ (التمہید، ج۳، ص۳۳۵ والاستذکار، ج۲، ص۱۴۵) یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل آگ سے پکی چیزوں کے کھانے سے وضوء کرنے کا تھا۔ حافظ عبدالبر نے صراحت کی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ کی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور امام زہری بھی یہی کہتے تھے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل وضوء کرنے کا تھا۔ اور اسی پر صحابہ میں سے حضرت عائشہ صدیقہ کے علاوہ ام المومنین ام حبیبہ، زید بن ثابت، عبداللہ بن عمرو، ابوموسیٰ اشعری، ابوہریرۃ، ابوعزۃ یسار بن عبدالہذلی اور عبداللہ بن عمر، ابوطلحہ انصاری، انس بن مالک (علی خلاف منہم) کا عمل تھا، اور تابعین میں سے خارجہ بن زید بن ثابت (یکے از فقہائے سبعہ) اور ابوبکر بن عبدالرحمٰن اور ان کے بیٹے عبدالملک، محمد بن المنکدر، عمر بن عبدالعزیز (خلیفہ راشد) ابن شہاب، ابوقلابہ، ابومجلز لاحق بن حمید، حسن بصری، یحییٰ بن یعمر رحمہم اللہ کا مسلک بھی یہی تھا، اگر صحابہ کے دور میں دونوں حدیثوں میں سے کسی ایک کا ناسخ اور دوسرے کا منسوخ ہوجانا متحقق ہوتا تو پھر اس اختلاف کی کہاں گنجائش تھی، اس مسئلہ میں اطمینان بخش بات وہ ہے جسے امام بیہقی نے عثمان دارمی کے حوالہ سے بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس باب میں جب احادیث مختلف تھیں اور یہ متعین نہیں ہوسکا کہ ان میں ناسخ کون ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرات خلفائے راشدین کے عمل کے مطابق ترک وضوء کی حدیث کو راجح قرار دے کر اسی کو معمول بنالیا گیا، (اور اب تمام فقہائے اسلام کا یہی مذہب ہے) اور اسی راجح کو ناسخ اور مرجوح کو منسوخ سے تعبیر کیا جاتا ہے اس نوع کے نسخ کو نسخ اجتہادی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محقق ابن ہمام نے صراحت کی ہے کہ جب متعارض نصین میں یہ معلوم نہ ہوسکے کہ کون مقدم اور کون مؤخر ہے اور ان میں سے کسی ایک کا

کسی وجہ ترجیح سے راجح ہونا معلوم ہو جائے تو "تضمن الحکم بنسخ الآخر" (فتح القدیر، ج ۵، ص ۲۰۱) حضرات ائمہ اسی معنی کے لحاظ سے اس قسم کی احادیث کو منسوخ کے لفظ سے تعبیر کر دیتے ہیں اس لفظ سے کسی دھوکہ میں مبتلا ہونے کے بجائے اس کی حقیقت پر نظر رکھنی چاہیے۔

حافظ ابن ہمام کے اس قول پر شارح منیۃ المصلی علامہ ابن امیر الحاج متوفی ۸۷۹ھ نے یہ کلام کیا ہے: "بقی ان یقال انه لا یجوز "النسخ بالاجتهاد" نعم قد يناقش فی تسمية هذا نسخاً ويقال: انما يسمی ترجيحاً لكنه نزاع لفظی" فقیہ ابن امیر حاج کے اس کلام سے معلوم ہو گیا یہ نسخ معروف کے معنی میں نہیں؛ بلکہ ترجیح احد الدلیلین علی الآخر کے قبیل سے ہے۔ یعنی چاہے اسے نسخ اجتہادی کہہ لیں یا نوع من الترجیح دونوں کا حاصل ایک ہے، اس نوع کے نسخ میں ائمہ کے مابین اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔

بعینہ یہی صورت تیسری مثال یعنی حدیث "اذا صلی جالسًا فصلوا جلوسًا اجمعون" کی بھی ہے اس حدیث کو بھی منسوخ کہا جاتا ہے؛ مگر یہ نسخ بھی از قبیل نسخ اجتہادی ہی کے ہے نسخ بمعنی مشہور نہیں ہے، اسی بناء پر صحابۂ کرام میں سے چار صحابی اسی حدیث کے مدلول پر عمل کرتے تھے کہ امام جب کسی عذر سے بیٹھ کر نماز پڑھے تو مقتدی اس کی اقتداء بیٹھ کر کریں اسے منسوخ نہیں کہتے تھے۔ یہ چار صحابہ یہ ہیں: حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر، حضرت اسید بن حضیر اور قیس بن فہد رضی اللہ عنہم، ائمہ اربعہ میں سے امام احمد بن حنبل کا اور دیگر ائمہ مجتہدین اور فقہائے محدثین میں سے امام اوزاعی، حماد بن زید اور اسحاق بن راہویہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے (المغنی لابن قدامہ، ج ۲، ص ۲۷)

اور مرضِ وفات کے موقع پر جو آپ ﷺ نے بیٹھ کر اور آپ کی اقتداء میں صحابہ نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی ہے، امام احمد اس کی توجیہ پیش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نسخ منصوص یا بحکم منصوص میں نہ اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ ہی ناسخ میں کسی

توجیہہ وتاویل کی، اس لیے ان دونوں حدیثوں کو علی الاطلاق نسخ کی مثال میں پیش کیا جانا صحیح نہیں ہے۔

(۱۱) ناسخ ومنسوخ احادیث کی بحث کے بعد مرتب رسالہ نے اس ضروری امر پر روشنی ڈالی ہے کہ نسخ کے معلوم ہونے کے ذرائع کیا ہیں، چنانچہ اس سے متعلق یہ عنوان وضع کیا ''حدیثوں میں نسخ کا علم تین طرح سے ہوگا'' پھر اس کے تحت تینوں طریقوں کو بیان کیا ہے، لکھتے ہیں:

پہلا: یہ کہ نسخ کی صراحت کردی جائے جیسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ''مامست النار'' کے سلسلہ میں فرمایا ''آخر الامرین من رسول الله صلى الله عليه وسلم ترك الوضوء مما غيرت النار''.

دوسرا: قرینہ سے معلوم ہوگا جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''كنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها'' (ترمذی باب ما جاء فی الرخصة فی زیارة القبور، کتاب الجنائز) (بلفظه، ص ۳۰)

آں موصوف کی یہ پوری عبارت پڑھ کر اگر کوئی طالب علم حیرت واستعجاب کا اظہار کرے تو اس پر کبیدہ خاطر یا ناراض ہونے کے بجائے سنجیدگی سے غور وفکر کی ضرورت ہے؛ کیونکہ یہ پوری عبارت غلطیوں کا مجموعہ ہے۔ ایک ایسا صاحب علم جو خود اپنے بارے میں یہ اطلاع دے رہا ہے کہ ''طلبہ کی ایک مختصر جماعت کو جلالین شریف، مشکوٰۃ شریف، طحاوی شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، بخاری شریف وغیرہ کتابوں کے پڑھانے کی سعادت نصیب ہوئی (حدیث وسنت میں فرق بعنوان عرض مرتب، ص ۵)

تعلیم وتدریس کے اس مقام بلند وبالا سے سرفراز ہونے کے باوصف کہ جس کے بعد اس شعبہ میں بلندی کا کوئی درجہ ہی نہیں، وہی جب نسخ کے ذریعہ معرفت پر گفتگو کرتا ہے تو الف سے یا تک کوئی بات بھی صحیح نہیں کرتا تو بلاشبہ یہ جائے حیرت ہی نہیں بلکہ مقام افسوس بھی ہے۔

میرے محترم آپ نے لفظ آخر الامرین دیکھ کر کہ یہ انتہا اور اختتام کے معنی میں

صریح ہے، اس پر نسخ صریح کا حکم چسپاں کر دیا، آخر یہ کیوں نہیں سوچا گیا کہ اس کا کہنے والا کون ہے، ہاں یہی بات اگر خود صاحب امر صلی اللہ علیہ وسلم بتاتے تو بلاشبہ یقینی طور پر یہ نسخ کی ایسی صراحت ہوتی کہ اس کے بعد کسی مزید تصریح کی اصلاً ضرورت نہ ہوتی، مگر یہاں یہ اطلاع دینے والا غیر ہے، اگرچہ وہ صحابی ہیں مگر ہیں غیر ہی اور یہ بات معلوم و متحقق ہے کہ کسی دوسرے کے کسی کام یا بات کی خبر دینے والا یہ خبر اپنے علم و دانست کے اعتبار ہی سے دیتا ہے، جس میں یہ برابر کا احتمال ہوتا ہے کہ اس کا یہ علم واقع اور نفس الامر کے مطابق ہو، اور ہوسکتا ہے کہ واقع کے موافق نہ ہو۔ اس احتمال کی دلیل حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابوہریرہ اور امام ابن شہاب زہری رضی اللہ عنہم کا قول ہے جو ناسخ و منسوخ کی پہلی بحث میں گزر چکا ہے کہ "كان آخر الامرين من رسول الله صلى الله عليه وسلم الوضوء مما مست النار" دونوں فریق اپنے اپنے علم و دانست کے مطابق یہ خبر دے رہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ دونوں میں سے لاعلی التعین ایک ہی کا قول واقع کے مطابق ہوگا۔

علاوہ ازیں امام ابوداؤد اپنی سنن میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں "هذا اختصار من الحديث الاول" اپنے اس قول سے امام ابوداؤد یہ اشارہ کر رہے ہیں کہ حضرت جابر کے اس قول سے وضو مما مست النار سے نسخ پر استدلال مناسب نہیں ہے؛ کیونکہ ان کا یہ قول اس بات میں صریح نہیں ہے، کہ علی الاطلاق ترک وضو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری فعل تھا؛ بلکہ اس سے اوپر حضرت جابر سے مروی جو روایت ہے کہ نماز سے فارغ ہوکر آپ نے بچے ہوئے کھانے کو طلب کیا اور اس میں سے کچھ کھایا پھر نماز کے لیے تشریف لے گئے اور وضو نہیں فرمایا، ترک وضو کا یہ عملا اس مجلس کا آخری عمل تھا نہ کہ مطلقاً ترک وضوء کا" حدیث میں اس توجیہہ کے بعد اس سے نسخ کا ثبوت ہی نہیں ہوگا پھر اسے نسخ پر صراحت کہنا تو دور کی کوڑی لانا ہوگا۔

اسی بناء پر صاحب دل ونظر بزرگ شیخ عبدالوہاب شعرانی متوفی ۹۷۳ھ اپنی

معروف تصنیف "كشف الغمة عن جميع الامة" میں رقمطراز ہیں:

ولم امل فيه الى تاويل حديث ولا الى النسخ بالتاريخ كما يفعله بعضهم ادباً مع رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ان يتقيد كلامه فيما فهمه عالم دون آخر، وان ينسخ غيره كلامه، اذ لا ناسخ لكلامه الا هو، كقوله: "كنت نهيتكم عن زيارة القبور، فزوروها" وكقوله: كنت نهيتكم عن لحوم الاضاحى، فادّخروا، وكنت نهيتكم عن الانتباذ فى الحنتم والنقير فانتبذوا" ونحو ذلك.

وكيف يذهب احد الى نسخ كلامه من غير وحى الٰهى؟ ولا سيما ان كان ذلك الحديث اخذ به امام من ائمة الدين وتبعه عليه المقلّدون، فان ذلك سوء ادب معه صلى اللّٰه عليه وسلم ومع ذلك الامام الذى اخذ به، وقول بعضهم: آخر الامرين من رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم هو المعمول به وهو الناسخ المحكم" اكثرى لا كلّى، لانه لو كان كلياً لحكمنا بنسخ احد الامرين من رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم من نحو مسحه راسَه كلَّه فى الوضوء، او بعضه، أو من الوضوء من لمس المرأة او الذكر، او عدم الوضوء من ذلك، لانه لابد ان يكون قد انتهىٰ آخر امره الى واحد دون الآخر، و اذ نسخنا الاول حكمنا ببطلان صلاة صاحبه، وقس على ذلك. (بحوالہ الاجوبۃ الفاضلۃ عن الاسئلۃ العشرۃ الکاملۃ لمولانا عبدالحئ فرنگی محلی، ص۴۰)

یہ اقتباس اگرچہ طویل ہے، مگر بہت سے فوائد پر مشتمل ہے، خلاصہ حسب ذیل ہے:

❁ بارگاہ رسالت کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے کسی حدیث میں اپنی فہم پر اعتماد کرتے ہوئے تاویل وتقیید نہ کی جائے اور نہ تاریخ (یعنی تقدیم وتاخیر) کی بنیاد پر اسے منسوخ ٹھہرایا جائے۔

❁ اپنے کلام کو صرف اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی منسوخ کر سکتے ہیں کسی اور فرد بشر کو یہ اختیار نہیں۔

❁ بغیر وحی الٰہی کی استناد کے کلام رسول میں ﷺ کو منسوخ قرار دینے کی جرأت درست نہیں جبکہ وہ ائمہ دین میں سے کسی کا مستند و معمول بھی ہو، یہ رویہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اور اس امام کے حق میں از قبیل بے ادبی ہے۔

❁ بعض اسلاف کا ارشاد کہ آخر الامرین من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی معمول بہ ہے اور یہی بلاشبہ ناسخ ہے یہ کلی نہیں؛ بلکہ اکثری ہے (اس صورت میں اسے بالجزم ناسخ کیسے کہا جا سکتا ہے)

❁ اس قول کے کلی ماننے کی صورت میں دونوں میں سے ایک امر پر نسخ کا لازمی طور پر فیصلہ کرنا پڑے گا، ان امرین میں سے مثلاً آپ کا کل سر کا مسح کرنا، اور بعض سر کا مسح کرنا ہے، مس مرأۃ و ذکر سے وضوء کرنا، اس سے وضوء نہ کرنا ہے۔ اس طرح کے دو کاموں میں سے ایک پر لازماً آپ کا عمل منتہی اور ختم ہوا ہوگا، نہ کہ دوسرے پر، تو عمل اوّل کو منسوخ قرار دے دینے پر ائمہ میں سے جن حضرات کا یہ معمول بہ ہے ان کی نماز پر بطلان کا فیصلہ کرنا پڑے گا (اور امور اجتہادیہ کے بارے میں یہ فیصلہ متفق علیہ قول کے یکسر خلاف ہے، اس لیے آخر الامرین کے ناسخ ہونے کے قول کو کلی کے بجائے اکثری قرار دیے بغیر چارہ نہیں ہے)

(۱۲) آگے لکھتے ہیں:

''دوسرا قرینہ سے معلوم ہوگا'' جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''کنت نہیتکم عن زیارۃ القبور، فزوروھا'' اس حدیث میں قرینہ ہے کہ قبرستان جانے کی ممانعت دور اوّل میں تھی، بعد میں اجازت ہوگئی، پس جواز کی روایات سنت ہیں اور ممانعت کی روایتیں صرف حدیث ہیں'' (ص ۳۰)

یعنی تقدم و تأخر کا علم قرینہ سے حاصل ہوگا، لہٰذا قرینہ سے جس حدیث کا زمانۂ ورود مؤخر ہوگا وہ ناسخ اور اس سے پہلے کی منسوخ ہوگی، اس قرینہ سے ثابت علم کی مثال میں حدیث مبارک: ''نہیتکم عن زیارۃ القبور، فزوروھا'' پیش کی ہے، پہلی قسم جسے صراحت کا نام دیا تھا اس کا حال اوپر مذکور تفصیل سے معلوم ہو چکا ہے۔

اس دوسری قسم میں بتایا جارہا ہے کہ اس میں نسخ کا علم قرینہ سے معلوم ہوگا اور اس کی تفہیم کے لیے بطور مثال مذکور حدیث پیش کی گئی ہے۔ اس مثال کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے: ''اس حدیث میں قرینہ ہے کہ قبرستان جانے کی ممانعت دور اوّل میں تھی'' (بلفظہ) آں موصوف کی یہ عبارت ایک نہیں؛ بلکہ بار بار پڑھ کر خدارا بتایا جائے کہ جس قرینہ کا ذکر کیا جارہا ہے وہ کیا ہے؟ ہماری فہم ناقص نے تو بس اتنا ہی سمجھا ہے کہ عنوان میں جو لفظ قرینہ تھا اس کی مثال کی تشریح وتوضیح میں اسی کو دہرادیا گیا ہے، کہ ''اس حدیث میں قرینہ ہے'' اس لاطائل اور غیر مفید وضاحت کی اصل وجہ یہ ہے کہ باب نسخ کا یہ قرینہ محض ادّعائی ہے، ''عنقا'' کی طرح خارج میں اس کے وجود کا کوئی اتا پتا نہیں ہے، تو ایک شئے غیر معلوم کی تشخیص وتعین کیونکر ممکن ہوگی، پھر اپنے مفروضہ قرینہ کی مثال میں جس حدیث پاک کو پیش کیا گیا ہے وہ اپنے معنی ومفہوم کی تصریح میں کسی ضم ضمیمہ اور قرینہ کی ادنیٰ محتاج نہیں ہے۔ عربی درجۂ اوّل کا طالب علم بھی بخوبی جانتا ہے کہ "نهيتُ" فعل ماضی ہے جو وضعاً وحقیقتاً گزرے زمانہ کو بیان کرتا ہے اور ''فزوروا'' فعل امر ہے جو اصالۃً زمانۂ حال پر دلالت کرتا ہے، یہ دونوں فعل اپنے معنی اصلی کی دلالت میں خود مستقل ہیں کسی شئے خارجی کی انھیں کوئی احتیاج نہیں ہے، کہ یہ بتایا جائے کہ ''اس میں قرینہ ہے کہ قبرستان جانے کی ممانعت دور اوّل میں تھی'' ہاں جب کوئی لفظ اپنے حقیقی معنی کے بجائے معنی مجازی میں استعمال کیا جائے تو اس معنی مجازی کے سمجھنے کے لیے قرینہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ امام محقق علامہ محمد بن ابراہیم الوزیر یمانی متوفی ۸۴۰ھ نے اسی قاعدہ کو بڑے بلیغ اسلوب میں یوں بیان کیا ہے: "علامة المجاز هو لا يسبق الفهم اليه الا بقرينة" (العواصم والقواصم، ج۷، ص۹۱) مجازی معنی کی علامت یہ ہے کہ فہم قرینہ کے بغیر اس کی طرف نہ بڑھے۔ صاحب کتابچہ ''حدیث وسنت میں فرق'' کے یہ علم وفہم کا کمالِ بے مثال ہے کہ جو بات نسخ کے جاننے میں بدرجہ احتمال تھی اسے تو صراحت کے مقام پر پہنچادیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک جو نسخ پر

بصراحت دلالت کر رہا ہے اسے محتاج قرینہ بنا دیا۔

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

حافظ ابوبکر محمد بن موسیٰ حازمی متوفی ۵۸۴ھ کی نسخ کے موضوع پر معروف اور نہایت مفید کتاب ''الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ من الآثار'' کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے، ممکن ہے کہ اسے پڑھ کر آنکھ ٹھنڈی اور دل شاد ہو جائے۔

وان لم یمکن الجمع وھما حکمان منفصلان نظرتَ ھل یمکن التمیز بین السابق والتالی، فان امکن اوجب المصیر إلی الآخر منھما ویعرف ذلك بامارات عدۃ منھا: ان یکون لفظ النبی صلی اللہ علیه وسلم مصرحاً به نحو قوله علیه الصلاۃ والسلام: کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور الا فزوروھا'' الخ (ص۹)

اور اگر (بظاہر دو متعارض احادیث میں) جمع و تطبیق ممکن نہ ہو اور وہ دونوں الگ الگ دو حکم ہیں تو اب غور کرو کہ ان کے سابق و تالی (آگے پیچھے) کے درمیان امتیاز ممکن ہے، اگر یہ تمیز ہو جائے تو ان میں سے آخر کی طرف رجوع لازم ہوگا، اور تقدم و تأخر کی معرفت متعدد علامتوں سے حاصل ہوتی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ اس معنی میں صریح اور واضح ہوں جیسے آپ کا ارشاد عالی ہے: کنت نھیتکم الخ میں نے تم کو گزرے زمانہ میں قبروں کی زیارت سے روکا تھا، بغور سنو اب بزمانۂ حال اس کی زیارت کی اجازت ہے۔

(۱۳) ''دوسری قسم: خصوصیت اور اس کی پانچ مثالیں'' ص۳۲۔

اس جملہ کی وضاحت خود آں موصوف نے صفحہ ۲۵ پر ان الفاظ میں کی ہے: ''دوسری وہ حدیثیں جو خصوصیات میں سے ہیں'' وہ صرف حدیث ہی ہیں سنت نہیں ہیں، چونکہ پہلے صراحت کر چکے ہیں کہ حدیث کی اتباع کا حکم نہیں ہے، صرف سنت کی اتباع کا حکم ہے، لہٰذا وہ تمام حدیثیں جو خصوصیت پر دلالت کرتی ہیں آں موصوف کے نزدیک وہ حجت اور قابل اتباع نہیں ہیں۔

(الف) آں موصوف نے اس عنوان کے تحت صرف ان پانچ احادیث کا ذکر کیا ہے جو رسول خدا ﷺ کی خصوصیت سے متعلق ہیں، جبکہ ان کے یہ الفاظ ''وہ حدیثیں جو خصوصیات میں سے ہیں'' بتارہے ہیں کہ وہ جملہ احادیث جو کسی فرد، نوع وغیرہ کی خصوصیت پر دلالت کرتی ہیں ان کے اس حکم میں شامل ہیں، اس لیے انھیں آں حضرت ﷺ کی خصوصیت پر دلالت کرنے والی حدیثوں کے علاوہ دیگر افراد وجماعت کی خصوصیت سے متعلق احادیث بھی بطور مثال پیش کرنی چاہیے تھی، یہ کون نہیں جانتا ہے کہ کچھ شرعی احکام وہ ہیں جو مردوں کے ساتھ خاص ہیں، عورتیں اس میں داخل نہیں ہیں، اسی طرح بعض احکام وہ ہیں جو عورتوں ہی کے لیے مختص ہیں مسلم مرد ان میں شامل نہیں ہیں، اسی طرح بہت سے ایسے احکام بھی ہیں جن کے مکلّف صرف اغنیا اور مالدار ہیں، فقراء مسلمین اس سے مستثنیٰ ہیں، وغیرہ بہت سے احکام شرعیہ ہیں جن میں خصوصیت کا وصف پایا جاتا ہے جیسا کہ فقہ کے طالب علم سے یہ امر مخفی و پوشیدہ نہیں ہے، تو کیا وہ ساری حدیثیں جو طبقات مسلمین کی الگ الگ خوصیتوں پر دلالت کرتی ہیں وہ سب محض حدیث ہیں اور نا قابل اتباع ہیں؟ ''بینوا وتو جرو''

(ب) علاوہ ازیں قرآن حکیم کی وہ آیات جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی خصوصیت کو بیان کرتی ہیں، ان کا حکم کیا ہے؟ جب نا قابل اتباع ہونے کی علت خصوصیت ٹھہری تو یہ علت ان آیات میں بھی پائی جارہی ہیں، کیا ان آیات قرآنیہ کے دلائل شرعیہ ہونے سے انکار ممکن ہے؟ آں جناب اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

(ج) ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا حکم شرعی، یا دلیل شرعی کے لیے عام ہونا ضروری ہے کہ یہ حکم جب تک پوری امت کو شامل نہیں ہوگا وہ حکم شرعی نہیں ہوگا؟ فقہ اور اصول فقہ سے معمولی واقفیت رکھنے والا بھی جانتا ہے حکم شرعی، یا دلیل شرعی کے لیے عام ہونا قطعی طور پر ضروری نہیں ہے، اس لیے کسی حکم یا دلیل کے خاص ہونے کی وجہ سے اس کے قابل اتباع اور حجت ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کہ یہ کہا جائے کہ خصوصیت کی وجہ سے وہ قابل اتباع اور حجت نہیں ہے۔

میرے محترم! کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ اللہ کے رسول علیہ الصلاۃ والسلام جو شریعت لے کر آئے ہیں اس شریعت کے امت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مکلّف ہیں، اگر وہ آیات یا احادیث جو کسی معاملہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت پر دلالت کرتی ہیں آپ کے حق میں حجت نہ ہوتیں تو عام امت کے برخلاف یہ امور آپ کیسے انجام دے سکتے تھے، اس لیے صاحب خصوصیت کے حق میں ان کی حجیت سے انکار ممکن ہی نہیں۔

علاوہ ازیں خصوصیت سے متعلق آیات قرآنیہ واحادیث نبویہ امت کے لیے بھی حجت ہیں اور ان کے مدلول کی اتباع ان پر واجب اور ضروری ہے، کیونکہ آں حضرت ﷺ مطاع مطلق ہیں اللہ رب العزت کا فرمان ہے: قُل اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ، الآیۃ، نیز ارشاد ربانی ہے: "اِنّ لَكُمْ فِى رسول الله اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" وغیرہ کا تقاضا یہی ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کی اتباع کی امت علی الاطلاق مکلّف اور پابند ہے۔ اب امت کے لیے یہی خصوصیت کی آیات واحادیث اس بات میں حجت ہیں کہ وہ امور اور معاملات جن کا تعلق آں حضرت ﷺ کی خصوصیت سے ہے وہ آں حضرت ﷺ کی اتباع مطلق سے مستثنیٰ ہیں۔ امت انھیں آیات واحادیث کے مدلول ومقتضی پر عمل کرتے ہوئے خصوصیات نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام میں ان کی پیروی نہیں کرتی ہے، اس لیے خصوصیت کی احادیث کو غیر حجت یا نا قابل اتباع بتانا کسی طرح سے بھی صحیح نہیں ہے۔ فتدبر وتشکر

آگے رقم طراز ہیں:

(۱۴) تیسری قسم مصلحت اور اس کی دو مثالیں: پہلی مثال آپ ﷺ کا کھڑے ہو کر پیشاب فرمانا مصلحتاً تھا، آپ ﷺ نے بعض کام مصلحت کے لیے کیے یہ حدیث ہیں مگر سنت نہیں الخ ص ۳۶۔

جناب والا آں حضرت ﷺ بعض کام ہی نہیں بلکہ آپ ﷺ کے جملہ امور مبنی بر مصلحت ہوا کرتے تھے، کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ اپنے افعال واعمال سے شریعت ہی کا

بیان فرماتے تھے اور مکمل شریعت بندوں کے مصالح پر مشتمل ہے۔ امام عزالدین سلمی متوفی ۶۶۰ھ لکھتے ہیں:

"الشريعة كلها مصالح: اما تدرأ مفاسد أو تجلب مصالح" (قواعد الاحكام فى مصالح الانام ص ۱۱) پوری شریعت مصالح ہی ہے یا تو وہ خرابیوں کو دفع کرتی ہے، یا اچھائیاں لاتی ہے، چونکہ اس مسئلہ پر ہم اپنے کتابچہ ''حجیت حدیث اور حدیث پر عمل کی صورتیں'' میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں اس لیے یہاں اسی اجمال پر بات ختم کی جارہی ہے تفصیل کے طالب کتابچہ مذکورہ کا مطالعہ کریں، نیز امام عزالدین کی اس موضوع پر گرانقدر تصنیف ''قواعد الاحکام'' کا مطالعہ نہایت مفید ہوگا۔

اس موقع پر یہ امر بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ اللہ کے نبی ﷺ ہمارے لیے مطاع مطلق ہیں، ''لہٰذا بقول آں جناب کے بعض کام آپ نے مصلحت کے لیے کیے ہیں'' تو اسی مصلحت کے تحت امت بھی آپ کی اتباع میں آپ کے طریقہ کے مطابق وہ امر انجام دے گی، نور الانوار میں ہے:

والصحيح عندنا ان ما علمنا من افعاله صلعم واقعاً على جهة من الوجوب اوالندب او الاباحة نقتدى به فى ايقاعه على تلك الجهة حتى يقوم دليل الخصوص" ص ۲۱۷.

(۱۵) آں جناب نے اپنے کتابچہ کے صفحہ ۴۲ پر عنوان ''سنت کا مفہوم'' کے تحت اپنی تائید میں مولانا ابوبکر غازی پوری مرحوم کی عبارت کا ایک اقتباس پیش کیا ہے، اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ''علمی خطبات'' میں جب ''حدیث وسنت میں فرق'' خطبہ چھپا تو جماعت اہل حدیث کے فکری تشدد کے زخم خوردہ بعض لوگوں کو اس خطبہ میں اپنے درد کا کچھ مداویٰ نظر آیا، انھیں افراد میں ہمارے محترم مولانا ابوبکر غازی پوری مرحوم بھی تھے، مولانا مرحوم نے اپنی حیات کے آخری چند سالوں میں جماعت اہل حدیث کے ذہنی انحراف اور فکری تشدد کا زبان وقلم سے کامیاب مقابلہ کیا تھا، اس خطبہ کو اول وہلہ میں انھوں نے بھی اپنا زادِ سفر اور معاون خیال کر کے اس کی تائید

میں کچھ سطریں اپنے مجلّہ میں تحریر کردی تھیں؛ لیکن اس خطبہ کو جب انھوں نے بغور پڑھا تو انھیں نہ صرف مایوسی ہوئی؛ بلکہ صاحب خطبہ کے علم وفکر پر انھوں نے واضح لفظوں میں تبصرہ بھی لکھا، دارالعلوم دیوبند کے ایک سے زائد اساتذہ اس روئیداد سے بخوبی واقف ہیں جن سے آپ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

اس لیے آپ کی جانب سے یہ حوالہ صحیح صورت حال سے ناواقفوں کو قدرے ذہنی خلجان میں مبتلا کرسکتا ہے؛ لیکن جن کے زیر مطالعہ مجلّہ ''زمزم'' ترتیب وار رہا ہے وہ جناب کی اس بے جا مطلب برآری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھیں گے؛ کیونکہ جس بات سے انھوں نے رجوع کرلیا تھا اسی بات کو ان کی طرف منسوب کر کے نقل کرنا علمی دیانت کے خلاف ہے۔ افسوس کہ ہمارے پاس مجلّہ ''زمزم'' کا فائل نہیں ہے ورنہ آپ کی ضیافت طبع کے لیے کچھ اقتباس ہم بھی نقل کردیتے ''لعل الله يحدث بعد ذلك امرا''

(۱۶) بالکل آخر میں آں جناب نے ڈاکٹر علامہ خالد محمود صاحب کی کتاب ''آثار الحدیث'' ج۱، ص۶۲ سے ایک عبارت بعنوان ''سنت اور حدیث میں فرق'' نقل کی ہے۔

بغیر کسی تبصرہ کے ہم اسی کتاب ''آثار الحدیث'' ج۱، ص۲۸۴-۲۸۵ کا ایک اقتباس درج کررہے ہیں اسے بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ علامہ موصوف عنوان ''حجیت حدیث'' کے تحت لکھتے ہیں:

''آج کے موضوع میں حدیث اور سنت دونوں سے مراد حضور اکرم ﷺ کی تعلیم ہوگی اور اس اعتبار سے یہ موضوع آپ کی سنت کو شامل ہوگا، آں حضرت ﷺ اپنی تعلیمات کے لیے سنت کا لفظ بھی عام استعمال فرماتے تھے، سو اس وقت حدیث اور سنت کو ہم ایک معنی میں لے کر حجیت حدیث پر بحث کررہے ہیں''

خود علامہ کی اس تحریر کے بعد آپ کو ان کا حوالہ کتنا مفید ہوگا اس کو آپ خود سوچ لیجیے، اس موقع پر ایک طالب علمانہ مشورہ ہے کہ کسی عبارت کو نقل کرنے سے پہلے اس

کے معنی ومفہوم پر اچھی طرح غور کر کے اسے بطور حوالہ پیش کیا جانا چاہیے ورنہ بات الٹی بھی ہوسکتی ہے۔

اب آخر میں اپنی ایک مجبوری کا ذکر کر کے اس تحریر کی تمت کرر ہا ہوں، وہ یہ ہے کہ آں جناب نے خلفائے راشدین کی سنت پر بھی روشنی ڈالی ہے، چونکہ یہ مسئلہ بڑا طویل الذیل ہے، اور بروقت اپنی کم فرصتی کی بناء پر اس سلسلے میں گفتگو جیسی چاہیے ممکن نہیں ہے، اگر توفیق الٰہی شامل حال رہی تو آیندہ کبھی اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی جائے گی، انشاء اللہ العزیز۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی شمس الھدایۃ والیقین وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین.

حبیب الرحمٰن اعظمی